October
2026

جدید تر ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور

مصطفیٰ زیدی
October
16

اسلم فرخی
October
23

سالگرہ مبارک

سلیم کوثر
October
24

سارہ شگفتہ
October
31

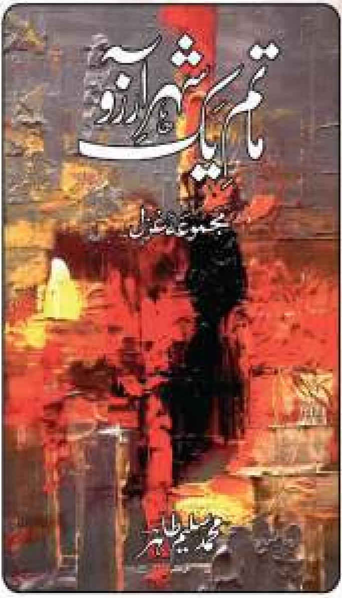
تم ایک شہرِ آرزو
مجموعۂ غزل
محمد سلیم طاہر

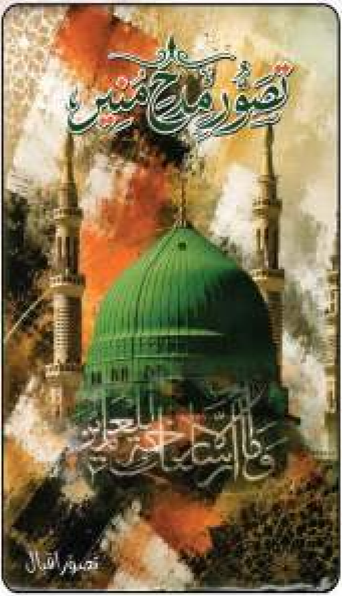
تصور اقبال

شہرِ تمثال دار
(ناول)
اختر رضا سلیمی

مظہر حسین سید

بانی مدیر خالد احمد

طلوع

جھلملا کر وہ مرے جسم کے ویرانوں میں
چاند کی طرح پس بند قبا ڈوب گیا

جگمگا کر ، مری راتوں کے سیہ خانوں میں
جھلملا کر وہ مرے جسم کے ویرانوں میں
عمر بھر ، رہ کے وہ گرداں مری شریانوں میں
پس آفاق حیا ، ماہ حیا ڈوب گیا

جھلملا کر وہ مرے جسم کے ویرانوں میں
چاند کی طرح پس بند قبا ڈوب گیا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL

Freight Forwarding

Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 37000901-9
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5252311 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - اکتوبر 2026 - شمارہ نمبر: 10

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: بیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب مصطفیٰ زیدی، جناب اسلم فرخی
جناب سلیم کوثر، محترمہ سارہ شگفتہ

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر و پرنٹر نے زیبک اینڈ سائی پرنٹرز 16 کلومیٹر رائے ونڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	محمد انیس انصاری	7
2	نعت	جلیل عالی، محمد یٰسین قمر، سید ریاض حسین زیدی، اعجاز کنور راجہ، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، شوکت محمود شوکت، محمد افضال انجم، احمد جلیل، رضا اللہ حیدر، نبیل احمد نبیل، مرتضیٰ سیّد، نعیم انجم فراز	8 تا 20
3	عقیدت	سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، ریاض ندیم نیازی، مرزا آصف رسول، آفتاب خان، عابد معروف مغل، نیر اقبال نجمی	21 تا 27
4	رباعیات	سعید اشعر، محمد نصیر زندہ	28 تا 29
5	ہائیکو	آفتاب خان	30
6	افسانے	محمد حمید شاہد، حامد یزدانی، آصف عمران، عمران امین، رانا محمد شاہد، شاہ روم خان ولی، سیّدہ وقیر کاظمی، نعمان منظور	31 تا 65
7	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، محمود شام، اعجاز کنور راجہ، سید ریاض حسین زیدی، محمد انیس انصاری، خاور اعجاز، اوریا مقبول جان، راحت سرحدی، افتخار شاہد، مسعود احمد، رضا اللہ حیدر، اجمل اعجاز، شوکت محمود شوکت، تنویر قاضی، قیوم طاہر، اقبال سروبہ، سعد اللہ شاہ، عاقر شہزاد	66 تا 134

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	احمد جلیل، کاشف حسین غائر، شفیق آصف، افروز رضوی فرحت عباس، محمد سلیم ساگر، اوصاف شیخ، علی حسین عابدی سمیع اللہ عرفی، محمد سلیم ساگر، افضل ہزاروی، شبہ طراز وسیم جبران، خالدہ انور، عاصم اعجاز، ہمایوں پرویز شاہد حسن جمیل، اشرف نقوی، شاہد ماکلی، دلشاد احمد، شبیر نازش اصغر علی بلوچ، احمد مسعود قریشی، اعجاز روشن، سرور فرحان راجہ عبدالقیوم، علی رضا، ساگر حضور پوری، علمدار حسین اکرم جاذب، امر مہکی، الماس شبی، صوفی محمد ضیا شاہد اکرام الحق سرشار، اعجاز دانش، آصف شفیع، شیخ اقبال محمد اشفاق بیگ، صغیر احمد صغیر، رخسانہ سمن، سجاد مجاہد نائلہ راٹھور، عابد معروف مغل، جیا قریشی، ردا حاصل خلوص سرفراز عارض، شبیر حسین بٹ، معظم علی خان، عابد رضا کرن گوندل، احمد نواز	66 تا 134
8	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، تسنیم سحر، محمد حمید شاہد، ہارون الرشید ارشد محمود ارشد، علی ارمان، سعید راجہ، فیاض تحسین افتخار الحق، کول شہزادی، مزمل حسین، سید محمد اصغر کاظمی رانا لیاقت علی، سیدہ آمنہ ریاض، محمد اکرم، زارا حیدر	135 تا 206
9	طنز و مزاح خاکہ	ہمایون خان، نور کمال شاہ	207 تا 215
10	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، محمد انیس انصاری، خاور اعجاز، سید افسر ساجد نثار ترابی، مسعود احمد، تنویر قاضی، فرخندہ شمیم، جمیل احمد عدیل طلعت شبیر، آسناتھ کنول، سمیع اللہ عرفی، عون الحسن غازی امجد بابر، اکرام حشمت، خالق آرزو، فرح شاہد، یٰسین بھٹی فیاض تحسین، شیخ اقبال، نائلہ راٹھور، ذہین احمد، محمد عبداللہ، اعجاز رضوی	216 تا 241

حمد

یہاں، وہاں، مرا ہر اِک معاملہ، تیرے ہاتھ
مجھے سنبھال! کہ ہوں ربِ کبریا، تیرے ہاتھ

زمیں سے اُٹھ کے، ترا عرشِ پاک چھوتی ہوئی
الٰہی! ٹوٹے ہوئے دِل کی ہر دُعا، تیرے ہاتھ

میں اپنے آپ کی بدصُورتی کہاں لے جاؤں
ہجومِ حشر میں ہوں، اور آئینہ تیرے ہاتھ

تلاشِ نقشِ کفِ پائے مصطفیٰؐ میں کُھلا
حضورؐ کا تو ہر اِک راستہ ہی تھا تیرے ہاتھ

میں جانتا ہوں کہ تجھ سا کریم کوئی نہیں
میں مطمئن ہوں، کہ ہے میرا فیصلہ تیرے ہاتھ

مجھے لگا، مری بینائی لوٹ آئی ہے
مرے جنوں نے مرا ہاتھ جب دیا تیرے ہاتھ

میں جتنی دیر ترے ذکرِ پاک میں رہا گُم
وہ کیسی ساعتِ خوش بخت تھی، رہا تیرے ہاتھ

مجھے خبر نہیں، لمحہ، جو آ رہا ہے ابھی
تجھے خبر سبھی، تقدیر کا لِکھا، تیرے ہاتھ

جہانِ ماضی و فردا، زمانۂ اِمروز
فسونِ اوّل و آخر، مرے خدا، تیرے ہاتھ

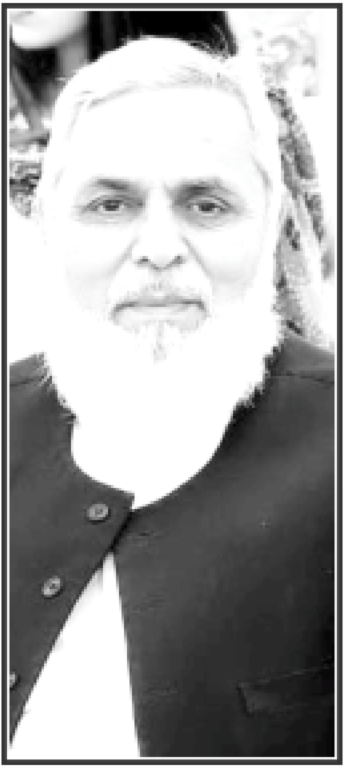

محمد انیس انصاری

’’وہی اوّل وہی آخر‘‘ [نعتیہ نظم]

’’وہی اوّل وہی آخر‘‘
حضورؐ کے
منصبِ رسالت سے بڑھ کے کیا
ان کے بعد
خود یہ مقام
یا اِس سے ملتا جلتا
کوئی بھی رتبہ
کسی بشر کے لیے بھی
رکھا نہیں خدا نے
جو لفظ اِس مرتبے سے
اُس کی مشیّتیں
خاص کر چکی ہیں
کسی کی بھی شان میں
برتنا نہیں مناسب
کہیں نبوت میں
شرک کا شائبہ نہ جاگے
نہ روحِ ایمان دُور بھاگے
اگر جدا احتیاط ٹوٹی،
نہ ہم نے یہ زاویے تیاگے
تو پھر سمجھ لیں
الجھ گئے زندگی کے دھاگے
بکھر گئے
نعتوں کے سارے بھرے پرا گے
زوال کی زاریاں
فقط خواریاں ہیں آگے

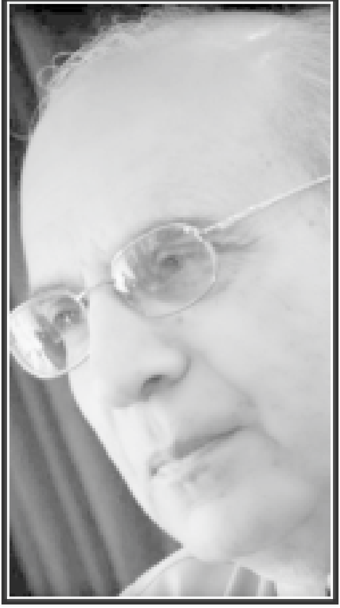

جلیل عالی

نعتؐ

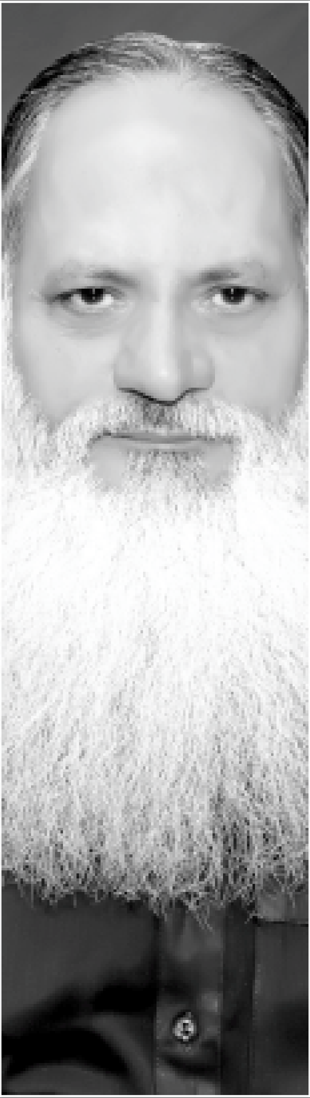

بے نور کائنات نے پائی ہے روشنی
"آئے جہاں میں آپؐ تو آئی ہے روشنی"

اک تیرگی کا راج تھا حدِ نگاہ تک
آپؐ آئے آ کے سب کو دکھائی ہے روشنی

سلمانؓ فارسی ہوں، صہیبؓ و بلالؓ ہوں
سب کو درِ مراد پہ لائی ہے روشنی

اک اک ورق حضورؐ کی سیرت کا دیکھیے
خوشبو ہے، آگہی ہے، بھلائی ہے، روشنی

تاباں خیال و خواب کی دنیا ہے اس لیے
ذکرِ نبیؐ کی اس میں سمائی ہے روشنی

پُرنور ہیں دلوں کے نگر اُنؐ کی یاد سے
وہ جن کی ذات رب نے بنائی ہے روشنی

ہر ذرہ آفتاب ہو جب سے اُسے قمر
غارِ حرا کو چوم کے آئی ہے روشنی

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

احاطہ کون کر سکا ہے رفعتِ خیال کا
حضورؐ ہی سے ہو سکا مشاہدہ کمال کا

جو شکوہ سنج تھے کبھی، گلے خوشی سے مل گئے
حضورؐ کی امان سے تھا خاتمہ ملال کا

نظر کہاں کہ دیکھ لوں نقوشِ پا حضور کے
زباں کہاں جو تذکرہ ہو قریۂ جمال کا

خدا نے خود بلا لیں، حضورؐ کی ثنائیں کیں
ہر ایک معترف ہوا کمال بے مثال کا

شرف میں جو بڑا ہوا، بڑا اُسے کہا گیا
شرق و غرب کا ہو یا جنوب یا شمال کا

گروہِ دشمنانِ حق جو تیرگی نشان تھا
مقابلہ نہ کر سکا، وہ روئے پُر جلال کا

خدا کرے نصیب ہوں شفاعتیں حضورؐ کی
خیال تک کبھی نہ ہو کسی طرح زوال کا

بفیضِ مصطفیٰؐ تمیزِ خیر و شر عیاں ہوئی
ہے فرق سب پہ منکشف حرام اور حلال کا

سرورِ نعتؐ لے گیا حضور شبہ ریاض کو
زہے کرم کہ مٹ گیا ہے فرق ماہ و سال کا

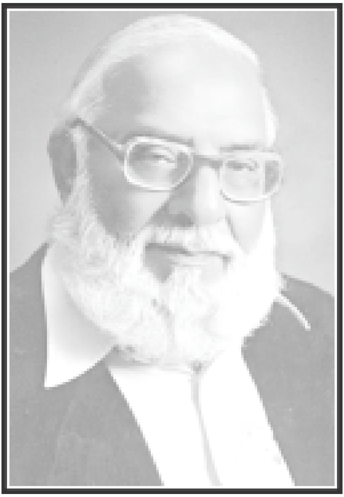

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

اگر یہ دل ہی مرا نعت خواں نہیں ہو گا
حضور آپ کا رتبہ بیاں نہیں ہو گا

نصیب میں ہے اگر اک جھلک مدینے کی
یہ عمر بھر کا سفر رایگاں نہیں ہو گا

یہ سچ ہے جس پہ حضور آپ مہرباں نہ ہوئے
خدا بھی اس پہ کبھی مہرباں نہیں ہو گا

خیال و خواب میں اتری حرا کی خاموشی
یہ دل اسیرِ زمان و مکاں نہیں ہو گا

نقوشِ پائے محمد دل و نگاہ میں رکھ
مکاں سے دور کبھی لامکاں نہیں ہو گا

ملے گا حشر کے میداں میں سایۂ رحمت
ہمارے سر پہ اگر سائباں نہیں ہو گا

ملیں گے آپ سے ہم آپ کے وسیلے سے
خدا گواہ کوئی درمیاں نہیں ہو گا

ہمیں یہ فکر نہیں ہے ہمارے صبر کا پھل
کہاں کہاں پہ میسر کہاں نہیں ہو گا

کنور وہ وقت بھی آئے گا ہم رہیں نہ رہیں
کہیں پہ کفر کا نام و نشاں نہیں ہو گا

اعجاز کنور راجہ

ذکرِ شاہِ انبیاءؐ

یا خدا تیری عطا آراستہ
مجھ پہ ہو جائے سدا آراستہ

یا محمدؐ پڑھ کے جب میں چل چلا
ہو گیا ہر راستہ آراستہ

زُلفِ محبوبِ خُدا کے حُسن سے
ہے مرا ہر سلسلہ آراستہ

سوچئے کن کے تصدق سے ہوئے
دو جہاں پیراستہ آراستہ

آپؐ کے صدقے سے جامیؒ کو ملا
نعت کا ہر راستہ آراستہ

خُلد کی کلیاں ہیں اصحابِ کرام
جیسے تاروں کی سبھا آراستہ

جلوہ کوہِ صفا کے فیض سے
اہلِ دل ، اہلِ صفا آراستہ

سبزۂ باغِ مدینہ سے ہوا
فکر کا جنگل ہرا آراستہ

نورِ شاہِ مرسلیںؐ کی دین ہے
کیوں نہ ہو دِل کا دِیا آراستہ

کائناتِ حُسن اُن سے ہیں حسیں
اُن سے ہیں ارض و سما آراستہ

ذکرِ شاہِ انبیاءؐ کے فیض سے
دل میں ہے نورِ خدا آراستہ

جلوہ زارِ نُورِ رب سے ہو گئے
اولیاء و اصفیاء آراستہ

اُن کی خاطر سج گئے افلاک سب
ہر طرف تھا راستہ آراستہ

اُس کا ثانی کب ہوا ہر دور میں
نورِ حق سے جو ہوا آراستہ

سیرتِ اطہر کی صورت میں ملا
زندگی کا آئینہ آراستہ

کیوں نہ نازِ کہکشاں ہو دل مرا
اِس میں ہے وہ خاکِ پا آراستہ

اے دِلِ سبطین طیبہ کو چلو
ہے وہی اِک راستہ آراستہ

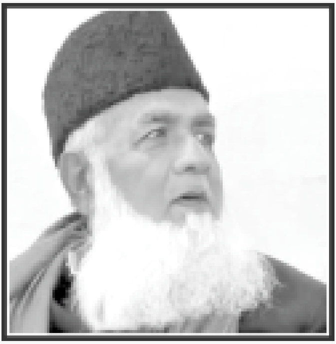

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

نعتؐ

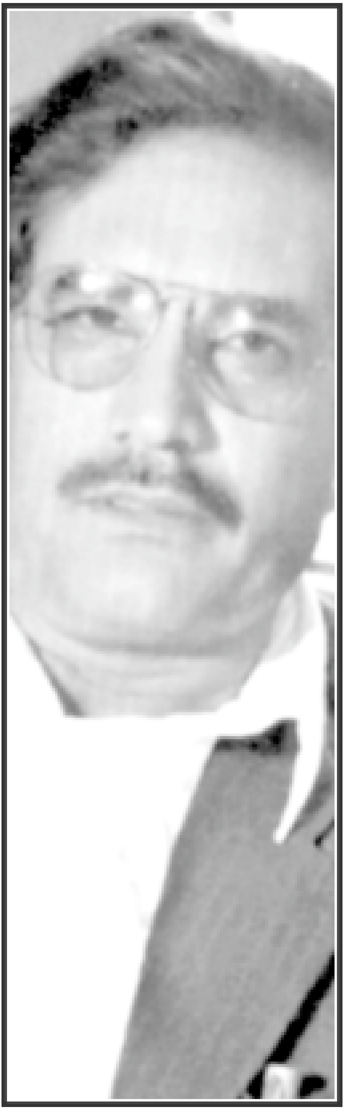

شوکت محمود شوکت

درد، جب بھی دلِ بیمار میں آ جاتے ہیں
اُٹھ کے ہم، قریۂ سرکارؐ میں آ جاتے ہیں

روزِ آغاز سے دونوں ہی اُجالا لینے
چاند سورج بھی دربار میں آ جاتے ہیں

اک ذرا ''صلے علی صلے علیٰ'' کہنے سے
پھول جیسے رہِ پرخار میں آ جاتے ہیں

حاصلِ زیست وہی پل ہیں حقیقت میں کہ جو
''قریۂ مدحتِ سرکارؐ میں آ جاتے ہیں

آپؐ کا اسوہ جو ہوتا ہے مرے پیشِ نظر
روز وشب، تب کہیں معیار میں آ جاتے ہیں

اک مدینے میں ذرا آپؐ کی آمد کے سبب
لوگ، سب حلقۂ ایثار میں آ جاتے ہیں

ڈھلتے جاتے ہیں کبھی نعت میں ازخود شوکت
لفظ جتنے مرے اشعار میں آ جاتے ہیں

نعتؐ

جو مرتبہ دیا ہے ثنائے حضورؐ نے
پایا ہے اس کو اعلیٰ گدائے حضورؐ نے

دنیا کی عز و جاہ کو وقعت کبھی نہ دی
ٹھکرائے مرتبے کف پائے حضورؐ نے

ہوتا ہے پیش کیسے حضور خدا کوئی
امت کو سب قرینے سکھائے حضورؐ نے

دور جہل کی باتیں سبھی محو ہو گئیں
ازبر اصول دیں کرائے حضورؐ نے

بعثت سے پہلے انؐ کی تھے بندے بھی خود خدا
بندے خدا کے بندے بنائے حضورؐ نے

جاتا ہے کس طرح سے خدا کی طرف بشر
جو حق تھے راستے وہ دکھائے حضورؐ نے

دین مبیں کی راہ کو آسان کر دیا
کانٹے تھے راہ میں جو ہٹائے حضورؐ نے

کل تک جو تھے خداؤں کے پیرو جہان میں
واحد خدا کے آگے جھکائے حضورؐ نے

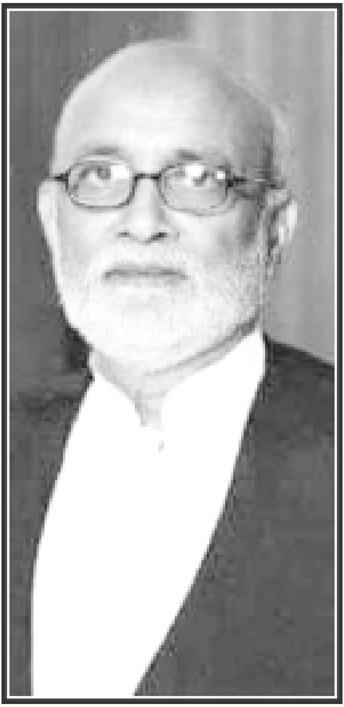

محمد افضال انجم

نعتؐ

درودوں کی صدائیں آ رہی ہیں
مدینے سے ہوائیں آ رہی ہیں

بہت خوش بخت ہیں وہ لوگ سارے
جنھیں ملنے گھٹائیں آ رہی ہیں

میں دشتِ معصیت میں جل رہا ہوں
مری جانب سزائیں آ رہی ہیں

گناہوں کا جہنم بجھ رہا ہے
کہ رحمت کی گھٹائیں آ رہی ہیں

نوید اے شوق اب منزل قریں ہے
معطر سی فضائیں آ رہی ہیں

مجھے رحمت کے دامن میں چھپا لیں
تعاقب میں بلائیں آ رہی ہیں

نبی کے عشق کی یہ ابتداء ہے
ابھی تو انتہائیں آ رہی ہیں

جلیل اُس نام سے جب ابتداء کی
اثر لے کر دعائیں آ رہی ہیں

احمد جلیل

نعتؐ

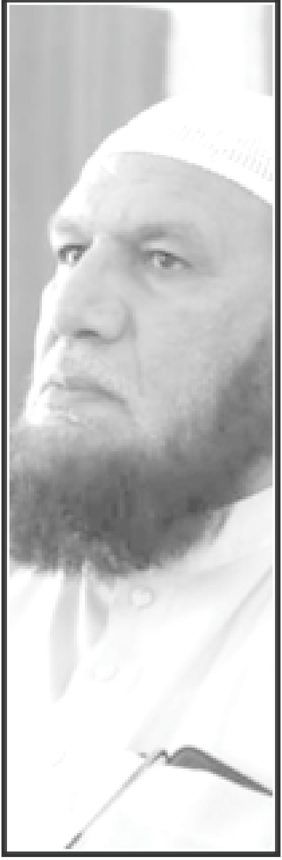

تعلیمِ نبیؐ سے سب نسلیں بے پایاں فیض اُٹھائیں گی
صدیوں نے فیض اُٹھایا ہے اور صدیاں فیض اُٹھائیں گی

ہے سرورِ عالم کا اسوہ منشورِ حقوقِ نسواں کا
مائیں بھی عظمت پاتی ہیں اور بیٹیاں فیض اُٹھائیں گی

اب سیدہ آمنہ بی بی کے گلشن میں بہاریں آئی ہیں
سب پھول بھی خوشبو پائیں گے سب کلیاں فیض اُٹھائیں گی

جبریلِ امیں لے آئے ہیں اللہ کا آخری سندیسہ
انسان کی عادتیں بگڑی ہوئی، سرگرداں، فیض اُٹھائیں گی

وہ رحمتِ ہر ہر عالم ہیں، خشکی و تری کے محسن ہیں
یہ مہر و ماہ کی قندیلیں آویزاں فیض اُٹھائیں گی

سرکارِ دو عالم کی سیرت ہر لحظہ رضا ہے پیشِ نظر
اُمت کی جماعت کی شاخیں سب یکساں فیض اُٹھائیں گی

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعت منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعتؐ

حدیثِ نور کا پیکر شہِ زمان و مکاں
خُدائے پاک کا مظہر شہِ زمان و مکاں

نبیل آپؐ سے بڑھ کر کسی کی ذات نہیں
نبیل سب سے ہیں بڑھ کر شہِ زمان و مکاں

عطائے عام زمان و مکاں پہ ہے تیری
عطائے خاص ہو مجھ پہ شہِ زمان و مکاں

عطائے رب کے ہیں مظہر شہِ زمان و مکاں
سپاہِ حق کے پیمبر شہِ زمان و مکاں

بچھا رہے ہیں بڑی دیر سے دنیا والے
ہماری راہ میں پتھر شہِ زمان و مکاں

اسے ہوائے مدینہ کی پھر ضرورت ہے
بنا ہے دہر پہ اخگر شہِ زمان و مکاں

بُرے دنوں کو بدلتے ہیں آپؐ پل بھر میں
ہیں آپؐ اوجِ مقدر شہِ زمان و مکاں

یہیں سے پیاس بُجھاتی ہے بے یقینی بھی
یقیں کے چشمۂ اطہر شہِ زمان و مکاں

ہر ایک شخص سے ارفع ہے آپؐ کی ہستی
ہر ایک شخص سے بہتر شہِ زمان و مکاں

سفر حضر میں رسائی تھی عرش تک جن کی
خُدا سے ربط کے یاور شہِ زمان و مکاں

وہ ابتدائے زمانہ وہ انتہائے جہاں
وہی ہیں اوّل و آخر شہِ زمان و مکاں

جہاں ضروری تھا تلوار بھی اُٹھائی ہے
مگر ہیں امن کے یاور شہِ زمان و مکاں

اُنھی کے دم سے ہے بزمِ جہاں میں رنگینی
ہیں رنگ و نور کا محور شہِ زمان و مکاں

جب آیا وقتِ اُحد صبر کے جلائے دیے
ہیں آپؐ نور کا پیکر شہِ زمان و مکاں

اُنھی کے رُوئے مقدس سے ہے جہاں روشن
حصولِ صبحِ منور شہِ زمان و مکاں

کلامِ پاک کی تفسیر ہے حیاتِ نبیؐ
ہدایتوں کے مفسر شہِ زمان و مکاں

اُنھی کے فیض سے ہم نے خدا کو پہچانا
ہمارے آقاؐ و رہبر شہِ زمان و مکاں

ہر اک یتیم کے سر پر ہے آپؐ ہی کا ہاتھ
ہیں کیا شفیق سراسر شہِ زمان و مکاں

کُشادہ ظرف کا مظہر ہر ایک سینہ ہو
مرا بھی سینہ ہے کم تر شہِ زمان و مکاں

خُدا کے ساتھ فرشتے درود بھیجتے ہیں
ہیں کتنے افضل و برتر شہِ زمان و مکاں

عروجِ فکر جہاں بھی پڑاؤ ڈالتی ہے
ہیں اُس مقام سے بڑھ کر شہِ زمان و مکاں

انھی سے پھیلی بصیرت کی روشنی ہر سُو
چراغِ چہرۂ انور شہِ زمان و مکاں

دلوں کی کھیتیاں شاداب ہوں ہری بھی ہوں
بفیضِ گنبدِ اخضر شہِ زمان و مکاں!

نہیں احاطہ تو ممکن نہیں ہے عظمت کا
خِرد کے بحر شناور شہِ زمان و مکاں

ہو مجھ پہ تیری عنایت ترا ہی لطف و کرم
رہوں میں تیرا ثنا خوان شہِ زمان و مکاں

معاف اُسے بھی کیا جس نے کوڑا پھینکا تھا
وہ درگزر کا ہیں پیکر شہِ زمان و مکاں

جہاں بھی اُلجھیں اُنھی سے رجوع کرتے ہیں
تدبرات کا دفتر شہِ زمان و مکاں

پلٹ پلٹ کے سوالی یہیں پہ آتے ہیں
کرم میں سب سے فزوں تر شہِ زمان و مکاں

عدم پناہ فقط آپؐ ہی سے لیتا تھا
رحیم یکساں ہیں سب پر شہِ زمان و مکاں

گہر عطا ہو تری نعت کا مجھے ایسا
نہ جس کا ثانی ہو یکسر شہِ زمان و مکاں!

ہر اک تجلّی سے روشن ہے آپؐ کی ہستی
چراغِ چہرۂ انور شہِ زمان و مکاں

نبیلؔ دونوں جہاں میں بس اتنی خواہش ہے
رہوں میں آپؐ کا بن کر شہِ زمان و مکاں

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

مرتضٰی سیّد

جہاں جہاں ہے جو بھی اجالا تیرے ہی دم سے
تاریکی سب دور ہوئی ہے تیرے کرم سے

دنیا بھر کی سب تعریفیں اسمِ محمدؐ
رتبہ آپ کا ارفع و اعلیٰ لوح و قلم سے

سب پھولوں کی ساری نکہتیں دھیان سے تیرے
نام پہ تیرے خوشبو آئے باغِ ارم سے

سیدھی سچی باتوں سے دل سب کے جیتے
مستثنیٰ تھی تیری حکومت طبل و علم سے

دامن اپنا حُسنِ عمل سے ایسا خالی
منہ نہیں دکھلا سکتے آقا ہم تو شرم سے

اندھیاروں میں جب بھی تیرا نام لیا ہے
پھوٹ پڑا ہے نور کا دھارا شامِ الم سے

اب بھی زمانہ راہِ ہدایت پا سکتا ہے
روشنی لے کر آقا تیرے نقشِ قدم سے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

نعتؐ

دل سے نکلی ہے مرے ایک دعا، لے جائے
کاش پیغام مرا بادِ صبا لے جائے

سیرتِ سیدِ ابرار جو اپناتا ہے
اپنے انداز زمانے سے جدا لے جائے

حاضری کے لیے مجھ کو بھی بلا لیں اک دن
کوئی سرکار تلک میری صدا لے جائے

اس کے محبوب کی دہلیز کو جا کر چوموں
جب کبھی مجھ کو مدینے میں خدا لے جائے

آئینہ ہے وہی کردارِ محمد کی قسم
جو اسے دیکھے وہی راہ ہُدیٰ لے جائے

پھر کرم ہو تو عنایت کی گھٹائیں برسیں
ایک جھونکا بھی کرم کا وہ صبا لے جائے

ہے گنہگار گدا آپ کے در کا یہ نعیم
خاک پلکوں پہ ترے در کی سجا لے جائے

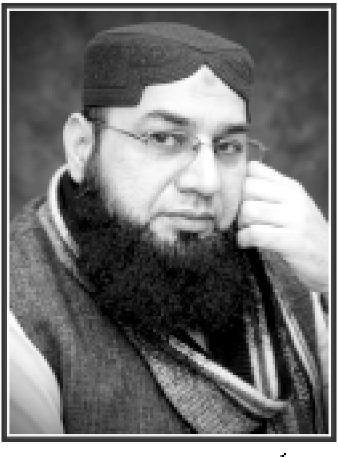

نعیم انجم فراز

مرے لب پر نوائے مصطفیٰ ہے
بڑی مجھ پر عطائے مصطفیٰ ہے

مجھے دیکھا نکیروں نے تو بولے
اِسے چھوڑو ، گدائے مصطفیٰ ہے

خدا اُن کا کہا کب ٹالتا ہے
رضائے رب ، رضائے مصطفیٰ ہے

مرے حامی و ناصر کیوں نہ ہوں وہ
مرے لب پہ ثنائے مصطفیٰ ہے

نبی کی آلِ اطہر سے محبت
یہی تو مدعائے مصطفیٰ ہے

مرے لب پہ سلام اُن کا سجا ہے
مجھے حاصل شفائے مصطفیٰ ہے

نعیم اس دل کا عالم کیا ہی کہنے
کہ جس دل میں ولائے مصطفیٰ ہے

عقیدت

درِ مصطفیٰؐ سے ہوئیں قربتیں
ٹلی ہیں زمانے کی سب کلفتیں

ہیں بے شک وہی رحمت عالمیں
خدا کی عطا ہیں انھیں رحمتیں

ہیں بعد از خدا آپؐ ہی محترم
ہر اک کی بڑھیں آپؐ سے رغبتیں

روا داریوں کی حمایت ہوئی
ہیں ملعون سب ناروا حرکتیں

ہیں سب معجزے انؐ کے فیض آفریں
دلوں کو مسخر کریں برکتیں

ہے دستِ نبیؐ بھی تو دستِ خدا
خداداد ہیں انؐ کی سب قدرتیں

ریاض ثنا خواں کی ہے التجا
کرے عمر بھر آپؐ کی مدحتیں

سیّد ریاض حسین زیدی

عقیدت

خاور اعجاز

برے زمانے میں بھی برگ و بار دیتا ہے
حسینیت کا شجر اعتبار دیتا ہے

حسینؓ صبح کا تارا ہے، اِک سہارا ہے
حسینؓ رات کا پرچم اُتار دیتا ہے

جہاں اندھیرا ہو لیجے وہاں حسینؓ کا نام
یہ نام منظرِ ہستی نکھار دیتا ہے

ستم کی رات اگر ہو تو کیجے ذکرِ حسینؓ
یہ ذکر ٹوٹے دِلوں کو قرار دیتا ہے

جو اُنؓ کی یاد میں آ جائے نوکِ مژگاں پر
وہ ایک اشک ہی قسمت سنوار دیتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے زیبِ زینِ توسنِ زرّیں زمام! رُک
گھبرا کے چھپ نہ جائیں ستارہ سخن تمام

عقیدت

کونین ہے صدف تو گہر اُس کا خدیجہؓ
منزل مرے آقاؐ ہیں، سفر اُس کا خدیجہؓ

ہے سایہ فگن موسمِ گُل جس پہ ہمیشہ
وہ گُلشنِ ایماں ہے، شجر اُس کا خدیجہؓ

ہے جلوہ فگن عالمِ نسواں پہ جو اِک نور
نسبت کا شجر ہے تو ثمر اُس کا خدیجہؓ

اِسلام پھلا پھولا سدا جن کی بہ دولت
کُنبہ ابو طالبؓ کا تو گھر اُس کا خدیجہؓ

منزل ہے اُسی کی جو پکارے گا نبیؐ کو
منزل ہے دُعا اور اثر اُس کا خدیجہؓ

مصروف قلم ترا ہے حق جوئی میں ہر دم
مدحت ہو رقم اور ہنر اُس کا خدیجہؓ

ریاض ندیم نیازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مرے سامنے حرم تھا، مجھے دیر ہو رہی تھی
سو، وجود بھی عدم تھا، مجھے دیر ہو رہی تھی

عقیدت

ہیں جانِ گفتگوئے لا الٰہ الا اللہ
محمدؐ آبروئے لا الٰہ الا اللہ

محمدؐ اسمِ محامد، اِسی ضیا سے مرا
سخن ہے مشک بوئے لا الٰہ الا اللہ

محمدؐ اول و آخر، ہیں اُن کے مہر و وفا
متاعِ جستجوئے لا الٰہ الا اللہ

محمدؐ افضل و اکمل، وہ شانِ کن فیکون
ہے روشن اُن سے خوئے لا الٰہ الا اللہ

محمدؐ اطہر و ازکیٰ، دلوں کے تزکیہ کی
رواں ہے اُن سے جوئے لا الٰہ الا اللہ

محمدؐ آئینہ حق ہیں اور بہ ہر جلوہ
وہی ہیں رُو بہ رُوئے لا الٰہ الا اللہ

محمدؐ آیتِ حُسن، اُن کا اُسوۂ حسنہ
ہے راہِ عشق سوئے لا الٰہ الا اللہ

محمدؐ اس لیے آئے کہ غلبۂ دیں سے
ہو پوری آرزوئے لا الٰہ الا اللہ

محمدؐ اِس کے ہیں ضامن کہ اب کوئی طاغوت
نہ ہوگا جو دُو بہ دُوئے لا الٰہ الا اللہ

نہ ہوں محمدؐ اگر مرجعِ اطاعتِ حق
تو کیا ہے ہاؤ ہوئے لا الٰہ الا اللہ

قسم بہ ختمِ نبوت کہ اب محمدؐ ہی
ہیں ساقی سبوئے لا الٰہ الا اللہ

وہی پہنچتا ہے آصف! درِ محمدؐ تک
ہو جس کا رُخ بہ کوئے لا الٰہ الا اللہ

مرزا آصف رسول

عقیدت

دل جو آقاؐ کی محبت سے بھرا رہتا ہے
ہر گھڑی اُنؐ کے لیے نعت سرا رہتا ہے

زرد موسم کبھی آتا ہی نہیں اِس دِل پر
سبز گنبد کے تصور سے ہرا رہتا ہے

اُنؐ کے روضے سے بہت دِن کی جدائی نہیں ٹھیک
قلب دُوری کے خیالوں سے ڈرا رہتا ہے

جسے آقا سے غلامی کی سَند مل جائے
اُس کا ہر وقت ہی کشکول بھرا رہتا ہے

جس کو آقاؐ سے کوئی ٹھوس عقیدت ہی نہیں
سانس لیتا ہے مگر پھر بھی مَرا رہتا ہے

آفتاب خان

انتخاب

- خالد احمد -

سرخ ہوئے، پھر نورِ نمو سے، پھولوں کے رخسار
عکسِ جمالِ یار سے ٹھہرا، ہر چہرہ گلنار

نعمان منظور

عقیدت

عابد معروف مغل

کرتے رہیں گے وہ سدا مدحت رسول کی
جن کے دلوں میں بس گئی الفت رسول کی

لب پہ نبی کا ورد ہو دل میں عقیدتیں
ایسوں کو مل ہی جاتی ہے نسبت رسول کی

ہر سو یہاں ہے ان کے وسیلے سے روشنی
دنیا سنوار دیتی ہے سنت رسول کی

رحمت برس رہی ہے زمانے پہ ہر گھڑی
بستی پہ میری کتنی ہے شفقت رسول کی

غم میں سکون دیتا ہے بس ذکرِ مصطفیٰ
دل کو قرار دیتی ہے نسبت رسول کی

ہم بے سہاروں کا وہ ہمیشہ ہیں آسرا
کافی ہے زندگی کو شفاعت رسول کی

دنیا کی ہر خوشی سے ہمیں کچھ غرض نہیں
دل کو فقط پسند ہے الفت رسول کی

دونوں جہاں میں آپ کا عابد غلام ہو
مرتے ہوئے نصیب ہو شفقت رسول کی

عقیدت

نیّر اقبال نجمی

میں اپنے نبی کی نعت لکھوں مجھ عاصی کی اوقات کہاں
تعریف فرشتے کرتے ہیں میرے آقا کی ہے بات کہاں

آباد محبت دل میں رہے ہونٹوں پہ سلام و ذکر سدا
میں عشقِ نبی کا مستانہ خاکستر ہے مری ذات کہاں

اب ہوش کہاں اس تن من کو میں ڈوبا آپ کی ہستی میں
عاشق ہوں مدینے والے کا پھر رُلتے مرے جذبات کہاں

اے کاش میں ایک پرندہ بنوں، طیبہ کی فضا میں اُڑتا پھروں
مرا مسکن باغِ مدینہ ہو دنیا کے حسیں باغات کہاں

جب ظلم کے بادل چھائے تھے دنیا میں جہالت برپا تھی
آقا کی جہاں میں آمد سے رہے منذر لات منات کہاں

تم حمد پڑھو اور نعت پڑھو پر دل بھی اپنے صاف رکھو
جسے شاہ کا جلوہ ہو جائے اُس جیسی ہے سوغات کہاں

رباعیات

پانا ہے کھونا ہے نہ ہونا میرا
ہنسنا ہے نہ رونا ہے، نہ ہونا میرا
میں تو کسی الجھن میں نہیں پڑتا ہوں
اب یہ مرا ہونا ہے، نہ ہونا میرا

....

اک مرکزی کردار مصیبت میں ہے
لگتا ہے مرا یار مصیبت میں ہے
ہم لوگ کہانی کے ہیں فرضی کردار
سامع یہاں بیکار مصیبت میں ہے

....

دیتا ہے صدا کون خدا ہی جانے
یہ مجھ سے ملا کون خدا ہی جانے
پہلے بھی اکیلا تھا، اکیلا ہوں اب
اندر سے گیا کون خدا ہی جانے

....

دیوار اُٹھا سکتا ہوں تو جو چاہے
دیوار گرا سکتا ہوں تو جو چاہے
لکھ کر ترا نام میں حسیں رنگوں سے
دیوار سجا سکتا ہوں تو جو چاہے

....

شب خواب میں پاتال جو میں نے دیکھا
ڈرنے لگا اجمال جو میں نے دیکھا
ہر سمت تھا آوازوں کا جنگل پھیلا
سناٹے کا جنجال جو میں نے دیکھا

کیوں آج پریشان ہے بیٹھے بیٹھے
بے چین ہے ہلکان ہے بیٹھے بیٹھے
ایسا تجھے دیکھا تو مرا دل بھی اب
ویران ہے سنسان ہے بیٹھے بیٹھے

....

میں تجھ کو پکاروں، ہے تقاضا دل کا
زخموں کو سنواروں، ہے تقاضا دل کا
مجھ پر ترے احسان ہیں، احسان بہت
کچھ قرض اتاروں، ہے تقاضا دل کا

....

سرکار کی جانب مرا رجحان نہیں
دربار کی جانب مرا رجحان نہیں
ایمان یہاں بکتا ہے کوڑی کوڑی
بازار کی جانب مرا رجحان نہیں

سعید اشعر

رباعیات

ہر روز مدینے سے دعا آتی ہے
بوسہ لینے مرا باد صبا آتی ہے
میں ان کا نام لکھتا ہوں کاغذ پہ
حرفوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

....

قندیلِ حرم ہے رخِ کونین کا چاند
قرآن کی روشنی ہے دارین کا چاند
تصویرِ کائنات کے ماتھے پہ
تقدیس کا خورشید ہے نعلین کا چاند

....

تشبیہ پہن کے استعارے اتریں
الفاظ کریں رقص نظارے اتریں
کونین کے سردار کی میں نعت لکھوں
صفحے کی ہتھیلی پہ ستارے اتریں

....

در چاہیے صیدِ بے زبوں کی خاطر
دیوار گرے مرگ سکوں کی خاطر
اوڑھا ہے میں نے زلفِ محمد کا خیال
کم ہے یہ جہاں مرے جنوں کی خاطر

....

چلتی ہے قلم پہ بادشاہی میری
الفاظ میں ہے پشت پناہی میری
لکھ کر شمس الضحیٰ سیاہی نے کہا
کتنی روشن ہے رو سیاہی میری

ہوتی ہے آرزو ریا کی ہم کو
کھا جائے نہ یہ بھوک انا کی ہم کو
ہم ہیں کسی نامراد منزل کا چراغ
لو چاہیے زلفِ مصطفیٰ کی ہم کو

....

پھولوں کی قبا فلک سواروں کو ملی
سونے کی چاندنی شراروں کو ملی
بے نور تھا تصویرِ دو عالم کا رنگ
آپ آئے تو روشنی ستاروں کو ملی

....

آندھی سے بات برملا کرتی ہے
مہمیز اسے اور ہوا کرتی ہے
اے روشنی کے نصیب تیری لو مجھے
ظلمت میں چراغ آزما کرتی ہے

محمد نصیر زندہ

ہائیکو

پھر چلیں گے طوافِ کعبہ کو
چشمِ نم سے بھگو کے دو پلکیں
چومنا ہے غلافِ کعبہ کو

اُس کے نازک خیال سے بھر کر
اپنے شانوں پہ خوشبوئیں دھر لیں
ایک گھڑی جمال سے بھر کر

کتابیں ہوں پڑھنی کتابیں خریدو!
کتابوں سے لے لو سبق زندگی کا
بنے عقل سے کام ہر اِک ندیدو!

مُفلسوں کا کبھی قصیدہ سُن!
تار اُلجھے رہے ہیں تاروں میں
کیوں ہُوا پیرہن دریدہ سُن!

اُس پہ بوندیں فلک سے اُتری ہیں
حُسن و رعنائیاں ہیں جتنی بھی
اُس پہ میری جھلک سے اُتری ہیں

موتیے کے پھول ہی چُنتا رہا
زندگی نے دی اُسے تعبیر جب
اپنے سارے خواب وہ بُنتا رہا

باغباں ہی چند کلیاں لے اڑا
پاؤں زخمی کر لیے اُس عشق نے
حُسن کا یہ موڑ جس جس نے مُڑا

پھر کسی قوس پر کَسا ہے تیر
یہ قبیلہ لہُو بہائے گا
اُس کی ہر نس میں اِک بسا ہے تیر

شام پھر سے ہوئی اُداس اُداس
رنگ دھانی بچھے ہیں کمرے میں
اور سانسوں میں اُس کے پہلی باس

ہونٹ چُپ ہیں، نظر ہوئی خاموش
دوریاں ہیں بہت دِلوں کے بیچ
اور ترستی ہے پیار کی آغوش

حُسن اُس کا دھنک بھی شرمائے
رنگ ناچیں اُسی کے گرد سبھی
جب وہ آنچل ہَوا میں لہرائے

گرم سانسوں کی بھاپ سُونگھ ذرا
زندگی کا مزا اِسی میں ہے
میرے پہلو میں آ کے اُونگھ ذرا

ناگ دوری کا یہ ہڑپ لے گا
دائمی وصل بَن سکے گا نصیب
تُو اگر ہجر میں تڑپ لے گا

دیس پردیس کی کہانی میں
ذکر اُس کا سدا ہی کرتے رہے
ہم سے بچھڑا تھا وہ جوانی میں

آفتاب خان

آخری سماعت

نورستان کے قدیم پایۂ تخت میں دارالانصاف کی عمارت دور سے سنگ شنگرف کے ایک خاموش قلعے کی مانند دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بلند ستونوں پر دوپہر کی دھوپ یوں آ کر ٹھہر جاتی تھی جیسے وقت خود یہاں دم بھرنے کو رک گیا ہو۔ نورستان دنیا کے اس حصے میں تھا جہاں آئین اور قوانین بڑی باریک بینی سے مرتب کیے جاتے تھے، اور انھی کی پاسبانی اور ان سے راہِ فرار بند کرنا انصاف کے اس عالی منصب کا کام تھا۔

اس قلعہ نما عمارت کے اندر عدالت نمبر ایک میں جب قاضی قاسم نذیر داخل ہوتے تو ان کے سیاہ چغے کا کنارا فرش کو آہستہ سے چھو لیتا۔ کمرے میں دبی دبی سرگوشیاں یکایک تھم جاتیں۔ وہ دراز قامت آدمی تھے۔ کندھے سیدھے، پیشانی کشادہ، آنکھیں گہری اور بے حد ٹھہری ہوئی، جیسے پلکیں جھپکنا بھول گئی ہوں۔ کنپٹیوں کی سفیدی میں ایسا وقار تھا جو صرف عمر نہیں، آزمائشیں عطا کرتی ہیں۔ وہ آزمائشوں سے اسی لیے گزرتے رہے تھے کہ فیصلے کرتے وقت وہ نہ حیلے بہانے دیکھتے تھے نہ تعلقات؛ صرف قانون اور ضابطہ سامنے رکھتے تھے۔ دارالانصاف میں ان کی آواز بلند نہ ہو کر بھی فیصلہ کن رہتی تھی، آخری فیصلے کی مانند۔ وکیلوں کی بیٹھک میں بزرگ وکیل کہا کرتے تھے کہ قاسم نذیر کے سامنے جھوٹ بولنا ایسا ہے جیسے شیشے کے سامنے دھواں چھوڑنا۔ دھواں چند ہی لمحوں میں چھٹ جاتا ہے۔ قاسم جانتے تھے کہ آدمی کی اصل جنگ عدالت کے اندر نہیں، اپنے نفس اور تنہائی میں ہوتی ہے۔

وہ شہر کے پرانے حصے میں ایک معمولی محرر کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا گھر، ایک کمرہ، اس کے آگے دو دروالا برآمدہ،

محمد حمید شاہد

برآمدے کے ایک گوشے میں چولہا، اور سامنے کچا صحن۔ بچپن میں ان کی ماں انھیں دھریک کے درخت تلے اسی صحن میں بٹھا کر پڑھاتی تھی۔ شام ڈھلے جب مدہم روشنی پھینکنے والا بلب روشن ہوتا تو صحن میں زرد روشنی پھیل جاتی۔ تب ان کے والد کہا کرتے:

''بیٹا، غربت آدمی کو نہیں مارتی، تعلق کا بوجھ اور بے اصولی مار ڈالتی ہے۔''

تب وہ نہیں جانتے تھے کہ تعلق بوجھ کیسے بنتا ہے، بعد میں بھی انھوں نے کسی تعلق کو اپنے اوپر بوجھ بننے نہ دیا۔ والد کا یہ جملہ ان کے اندر برسوں گونجتا رہا تھا۔ انھوں نے محنت سے قانون پڑھا، وکالت کی، پھر منصب قضا تک پہنچے، اور ایک ایک سیڑھی چڑھتے چڑھتے دارالانصاف جا پہنچے۔ ان کی اہلیہ سائرہ اکثر کہا کرتی: ''تمھارے اندر عجیب ضد ہے قاسم، دنیا تھک جاتی ہے، تم نہیں تھکتے۔'' وہ ہلکا سا مسکرا دیتے۔ ''انصاف کے منصب پر بیٹھنے والا اگر تھک جائے تو انصاف قضا ہو جاتا ہے۔''

گھر میں سادگی تھی۔ کشادہ بیٹھک تھی مگر اکثر خاموش رہتی۔ لکڑی کی پرانی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف ان کی میز اور کرسی رکھی تھی، جہاں وہ رات گئے تک کتابوں اور مقدمات کی ورق گردانی کرتے رہتے۔ کھڑکی کے پاس رکھا کیکٹس کے پودے کو سنبھالے سبز رنگا ہوا گملا تھا، سائرہ برسوں سے اسے خود پانی دیتی تھی، اور اب اس کی شاخیں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی تھیں۔

ان کا اکلوتا بیٹا حمزہ اس گھر کی رونق تھا۔ حمزہ اپنے والد کے برعکس نرم مزاج اور کھلے دل کا تھا۔ قانون سے زیادہ اسے لوگوں سے رغبت تھی۔ زیادہ وقت گھر سے باہر احباب میں گزرتا۔ کبھی کبھی وہ والد سے الجھ پڑتا کہ دوسرے اہلِ قضا کی طرح وہ بھی دنیا داری کیوں نہیں اپناتے۔ مگر قاسم نے ہمیشہ ایک ہی بات کہی: ''ایسا بوجھ کیوں اٹھایا جو آدمی کا ضمیر اور اس کی شخصیت کچل ڈالے۔''

حمزہ جامعہ میں تجارت و حساب کی تعلیم پا رہا تھا کہ مہرین جمیل سے دل لگا بیٹھا۔ یہ اس شام کا واقعہ ہے جب وہ ایک فلاحی مصوری کی نمائش دیکھنے گیا تھا۔ مہرین سفید لباس میں ایک تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔ تصویر میں ایک اجڑا ہوا محلہ تھا، بارش کے بعد کیچڑ بھری گلیاں، اور ٹھہرے پانی میں ٹوٹے دروازوں اور شکستہ دیواروں کی قدامت جھلک رہی تھی۔ حمزہ نے یہ منظر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھر لپک کر قریب ہوا اور مہرین کو متوجہ کر کے کہا: ''اداسی کی تصویریں کم خریدی جاتی ہیں۔'' وہ پلٹی، اسے لمحہ بھر کو

دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور لبوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ ''اداسی خریدی نہیں جاتی، یہ تو وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ باہر صرف اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔'' حمزہ خاموش، اسے دیکھتا رہ گیا اور اس کی آواز اس کے اندر گونجتی رہی۔ پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ کبھی کسی قہوہ خانے کے گوشے میں، کبھی کتابوں کی نمائش میں، کبھی شہر کے پرانے باغ میں شام ڈھلے۔ ایک روز ایک خوانچہ فروش نے حمزہ کے آگے شام کا اخبار بڑھا دیا۔ ان دنوں شام کے روزناموں میں تیز و تند خبریں شائع ہوتی تھیں۔ سڑکوں اور چوراہوں پر لڑکے اونچی آواز میں سرخیاں پڑھتے۔ شام کے روزنامے میں مہرین کے والد حارث جمیل کے متعلق ایک خبر تھی۔ مہرین نے نظریں جھکا کر کہا: ''لوگ ابا جان کو غلط سمجھتے ہیں۔'' اس نے حمزہ کے چہرے پر نگاہ کی اور لکنت زدہ لہجے میں اضافہ کیا: ''وہ۔۔۔وہ۔۔۔ سخت ضرور ہیں، مم مم مگر برے نہیں۔'' حمزہ نے بحث نہ کی۔ وہ کسی ایسے مسئلے پر بحث نہیں کرنا چاہتا تھا جو مہرین کو دل دکھائے۔ محبت دلیل سے پہلے دل میں جگہ بنا لیا کرتی ہے۔ حارث جمیل نورستان کے بااثر ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ خوش لباس، وجیہہ اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والا۔ مگر عدالت کی فائلوں میں اس کا دوسرا چہرہ محفوظ تھا۔ زمینوں کے جھگڑے، جعلی بستیاں، لوگوں کی عمر بھر کی جمع پونجی ہتھیانے والا، اور اوپر تک پہنچ رکھنے والا ایسا آدمی کہ ہر مقدمہ کہیں نہ کہیں جا کر دم توڑ دیتا۔ قاسم نے پہلی بار حمزہ سے مہرین کا نام سنا تو کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر نام دہرایا ''حارث جمیل؟''

''جی ابا جان۔'' حمزہ نے ترت کہا اور باپ کو دیکھنے لگا۔ قاسم کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے پر ڈوبتے سورج کی روشنی پڑ رہی تھی مگر چہرہ جیسے بجھا ہوا تھا۔ ''دیکھو بیٹا! کچھ نام عزت کے دامن پر پڑے دھبوں جیسے ہوتے ہیں۔'' وہ کھڑکی کے شیشے پر معمولی سے داغ کو ناخن سے کھرچ رہے تھے مگر ناکام رہے۔ ''مگر مہرین ویسی نہیں۔'' قاسم نے بیٹے کی آنکھوں میں ارادے کی سختی دیکھی۔ باپ کی ہر دلیل ہار گئی اور آخر کار حمزہ کے اصرار پر شادی ہو گئی۔ شہر کے بڑے لوگ آئے۔ قاسم سادہ شیروانی میں خاموش بیٹھے رہے۔ لوگ سرگوشیاں کرتے رہے۔ دلہن رخصت ہوئی تو سائرہ نے آہستہ سے کہا: ''میرے دل کو دھڑکا سا لگ گیا ہے کہ وقت بدل رہا ہے قاسم۔'' انھوں نے جواب نہ دیا۔ جواب میں کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

چند ماہ بعد نچلی عدالتوں سے گزرتا ایک مقدمہ ان کی عدالت میں آ پہنچا۔ ریاست بنام جمیل بلڈرز۔ اس ادارے کے ہزاروں متاثرین تھے۔ کسی کے خواب، کسی کی جمع پونجی، کسی کی چھت، سب لٹ چکا تھا۔ پہلی سماعت کے روز عدالت لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ پہلی صف میں ایک نحیف بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ سفید دوپٹے کے کنارے مروڑتی ہوئی۔ اس کی باری آئی تو کپکپاتی آواز میں کہا: ''عالی جناب! میرا شوہر تیس برس تک رکشہ چلاتا رہا۔ ہم نے پیٹ کاٹ کر پیسے جوڑے۔ گھر کی فائل خریدی اور وہ قبر میں جا سویا۔ مگر گھر۔۔۔'' اس سے بات مکمل نہ ہو پائی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عدالت خاموش ہو گئی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا۔ حمزہ اور مہرین پچھلی نشستوں پر آ بیٹھے۔ قاسم نے ایک لمحے کو سوچا کہ خود کو اس مقدمے سے الگ کر لیں، مگر پھر کچھ سوچ کر بیٹھے رہے۔

رات کو کھانے کی میز پر خاموشی تھی۔ سائرہ نے پوچھا: ''یہ کیس تو آپ کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے؟''۔ ''صرف مشکلات؟'' انھوں نے بیگم کی طرف دیکھا اور اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ انھیں محسوس ہوا جیسے دل نیچے کو پھسل رہا تھا۔ اتنے میں حمزہ اور مہرین بھی آ کر کھانے میں شریک ہو گئے۔ کچھ لمحے خاموشی میں گزر گئے تو حمزہ نے کہا: ''ابا جان، ہر الزام ثابت بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ قانون میں خاموش گنجائش ہوتی ہے۔'' قاسم نے چونک کر بیٹے کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا: ''بیٹا! ہر خاموشی بے گناہی بھی تو نہیں ہوتی۔'' مہرین نے یہ سن کر سر جھکا، کرسی پیچھے دھکیلی اور اُٹھ کر خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

چند دن بعد ایک گمنام لفافہ قاسم تک پہنچا۔ اس میں حسابی کھاتوں کی تفصیل تھی۔ بیرونِ ملک جائیدادوں کے کاغذات۔ خفیہ منتقلیوں کے اندراجات اور سب سے بڑھ کر حمزہ کے نام ایک تجارتی ادارے کے قیام کی تفصیلات۔ قاسم دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ مطالعہ گاہ کی دیوار پر گھڑی کی سوئیاں اپنی رفتار سے چلتی رہیں۔ کھڑکی کے باہر بارش برسنے لگی۔ انھیں اپنے (مرحوم) والد کی آواز سنائی دی: ''اصولوں پر قائم رہنے کی قیمت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔'' اس رات وہ نہ سو سکے تھے۔ سائرہ کو جیسے ان کی بے کلی کا احساس سوتے میں ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا: ''کیا ہوا؟'' انھوں نے کمزور آواز میں کہا: ''اگر انصاف میرے اپنے گھر سوالی بن کر آ جائے تو؟'' سائرہ نے دیر تک انھیں دیکھا اور کچھ سمجھتے ہوئے کہا: ''پھر فیصلہ جج نہیں، ایک باپ کرتا ہے۔''

آخری سماعت کے روز عدالت میں سانس

لینے سے بھی آواز کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ قاسم نے فیصلہ پڑھنا شروع کیا۔
”ریاست شہریوں کے اعتماد کی امین ہے۔“ پھر توقف کے بعد اضافہ کیا۔
”ثبوت اتنے ناقابلِ تردید ہیں کہ ملزم کے اثاثے ضبط ہو سکتے ہیں۔“ کمرے میں ہلچل ہوئی۔ حارث جمیل کا چہرہ زرد پڑ گیا۔
قاسم نے آخری ورق کھولا۔ سامنے حمزہ بیٹھا تھا جس کی آنکھوں میں خوف لہرا رہا تھا۔ پاس بیٹھی مہرین کے ہاتھ لرز رہے تھے۔
ایک لمحہ، صرف ایک لمحہ گزرا ہوگا کہ قاسم کی آواز بلند ہوئی: ”تاہم ابھی انصاف کے تقاضے پورے ہونے ہیں، سزا پر عمل درآمد مزید تفتیش سے مشروط رہے گا۔“ کمرے کی فضا بدل گئی۔ متاثرین کے چہرے بجھ گئے۔ حارث نے پہلی بار سکون کا سانس لیا۔ اور قاسم کو محسوس ہوا جیسے ان کے اندر کوئی چیز خاموشی سے ٹوٹ گئی تھی۔
حارث جمیل اپنی زندگی میں واپس لوٹ گیا۔ اب نہ عدالت کا خوف تھا نہ گرفتاری کا۔ تاہم وقت اپنی ادا سے چلتا ہے۔ ایک روز اس کی سواری ایک بھاری گاڑی سے ایسی ٹکرائی کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ سرکاری بیان میں حادثہ لکھا گیا۔ مقدمہ بند ہو گیا۔ اثاثے قانونی طور پر خاندان میں منتقل ہو گئے۔ حمزہ اور مہرین بہت کچھ سمیٹ کر دیارِ غیر چلے گئے۔ شہریوں نے کچھ دن شور کیا، پھر خاموش ہو گئے۔ جیسے ہر شور آخرکار خاموشی کی گپھاؤں میں کود جاتا ہے۔
برسوں بعد سبک دوشی کے دن قاسم عدالت کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ عمارت ویسی ہی شاندار تھی۔ ستون ویسے ہی خاموش۔
وہ گھر آئے۔ مطالعہ گاہ میں بیٹھ گئے۔ میز پر قانون کی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ اب انھیں ان کی ضرورت نہ تھی۔ انھوں نے انھیں پرے دھکیلا اور کھڑکی کی طرف دیکھا جس کے باہر شام اتر چکی تھی۔ دور مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور انھیں ایک نحیف عورت یاد آ گئی۔ ”قبر کے لیے بھی جگہ نہیں ---“ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی میں بے شمار فیصلے سنائے تھے۔ بہت سے مقدمے نمٹائے تھے مگر ان کے اندر جو عدالت لگ چکی تھی، وہ اس کے کٹہرے میں تھے۔ اور صرف ایک سوال تھا۔ ”جس دن تمھارے سامنے انصاف اور اپنا گھر ایک ساتھ کھڑے تھے، تم نے کس کا ہاتھ تھاما تھا؟“
یہ سوال وہ عمر بھر معرضِ التوا میں ڈالتے آئے تھے مگر اب یہ ملتوی ہونے سے انکاری تھا۔ ان کا ہاتھ اپنی چھاتی پر تھا اور پسلیوں کے اندر سے کچھ گہری اور گاڑھی سیاہ خاموشی اترتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

ممنوعہ حرف

عید کا دن آخری پہر میں داخل ہو چکا تھا۔ گھر میں عید ملن پارٹی کی تیاریاں جاری تھیں۔ مجھے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ کینیڈا آئے مدت ہو چکی تھی، اس لیے بچپن کی پاکستانی عیدوں کی رونق اور مہک اب دھندلی پڑ چکی تھی — سوائے شیر خورما اور قورمے کی خوشبو کے۔ عید کی نماز کے لیے یونیورسٹی کی دو کلاسز سے چھٹی لینا پڑی۔ ایک میں بعد دوپہر آن لائن شرکت کی، اور اب شام کی پارٹی کی تیاریوں میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔

صحن میں کرسیاں دوستوں اور رشتہ داروں کی بے ترتیب باتوں کی طرح ابھی خاموش پڑی تھیں۔ بچوں کے معصوم شور سے گھر کی فضا گونج رہی تھی۔ باورچی خانے سے اٹھتی دارچینی، لونگ اور الائچی کی خوشبو شیر خورمے کی مہک کے ساتھ مل کر ایک مانوس سا ماحول بنا رہی تھی۔ باہر پیڑوں کی شاخوں میں گھومتی ہوا میں بھی ایک ہلکی سی بے ترتیبی تھی — جیسے کسی نئے راز کے افشا کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔

میں کھانے کی پلیٹیں میز پر رکھ کر ہاتھ دھو کر صحن کی کرسیاں ترتیب دینے ہی والا تھا کہ مرکزی دروازہ کھلا۔ انکل اندر آتے دکھائی دیے۔

میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب میں عید کی مبارک باد بھی دی اور پھولوں کی باڑھ پار کرتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے۔ ہاتھ ملایا، تین بار مسنون معانقہ کیا، اور صحن پر نظر دوڑاتے ہوئے بولے:

"تو اس بار بھی بازی ہمارے ہاتھ رہی۔ کوئی اور مہمان نہیں آیا ابھی تک۔ ہمارا ریکارڈ توڑنا کوئی خالہ جی کا باڑہ واڑہ ہے کیا!"

میں نے مسکرا کر انھیں کرسی کی طرف اشارہ کیا اور پانی لینے اندر چلا گیا۔

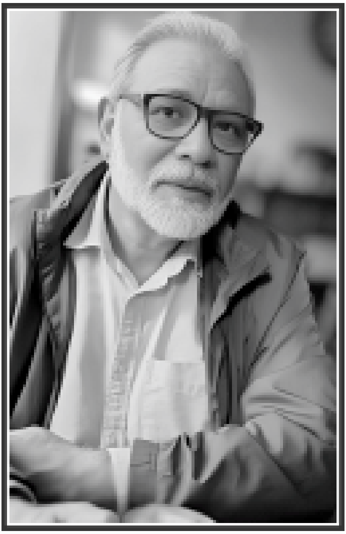

حامد یزدانی

واپس آیا تو انکل فون پر کچھ دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر فون رکھ دیا۔ پانی کا گھونٹ لیا اور بولے:

''ہاں بھئی نوخیز ادیب، اور سناؤ، کیا پڑھا وڑھا جا رہا ہے آج کل؟''

''جی کچھ خاص نہیں۔ ابھی ماریا ریوا کا ناول اینڈلنگ پڑھا ہے۔ روس اور یوکرین کی جنگ کے پس منظر میں——''

انکل نے ہاتھ اٹھا کر بات روک دی۔

''ارے وہ تو نرا فکشن وکشن ہے۔ اپنے اردگرد دیکھو، کتنے خوفناک حقائق بکھرے پڑے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں، نہ ہی دیکھو۔ رہنے دو۔ کیا ملے گا سوائے غم اور غصے کے۔''

ان کے لہجے میں امتناع سے زیادہ ترغیب تھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولے:

''آج میں خلاف عادت تمھیں پڑھنے سے منع کرنے والا ہوں۔ جو جی میں آئے پڑھو، مگر یہ مکروہ ایپسٹین فائلز کبھی نہ پڑھنا۔''

میں چونکا۔ رمضان، عید، گھر کی مصروفیات ——ایپسٹین فائلز ذہن میں کہیں نہ تھیں۔

''ایپسٹین فائلز...؟''

''ہاں، وہی۔ خبردار کرتا ہوں۔ انٹرنیٹ پر کوئی لنک سامنے آ جائے تو کلک شلک نہ کر بیٹھنا۔''

انھوں نے لاحول پڑھی، مگر ان کے انداز میں ایک دبی دبی سی لذت بھی تھی۔

''یہ مت سمجھنا کہ یونہی سنی سنائی باتوں پر منع کر رہا ہوں۔ میں نے غلطی کی تھی۔ پوری کی پوری پڑھ ڈالی۔ توبہ توبہ... انسانیت کہاں جا رہی ہے!''

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر انکل کی آواز بہتی چلی گئی۔

''اس میں لکھا ہے کہ کم عمر بچوں کے ساتھ... استغفراللہ... اور لڑکیاں کہاں کہاں کی... کیسے کیسے مظالم... اسی لیے کہتا ہوں، بیٹا، ان کے قریب بھی نہ جانا۔ نیندیں حرام ہو جائیں گی۔''

انھوں نے کرسی ذرا آگے کھسکائی، جیسے راز کو اور قریب لانا چاہتے ہوں۔

''بڑے بڑے لوگ ننگے ہو گئے ہیں ان میں۔ نام، تصویریں، سب کچھ۔ میں نے مفصل پڑھا ہے۔ ایک ایک صفحہ۔ توبہ توبہ...''

ان کی آنکھوں میں خوف سے زیادہ ایک ممنوعہ چمک تھی——جیسے کوئی سیاح کسی اجنبی دیس میں جھانک آیا ہو جس کا بیان معیوب بھی لگتا ہو مگر بیان کیے بغیر رہ بھی نہ پائے۔

''نوجوانوں کو تو بالکل نہیں پڑھنا چاہیے۔ اخلاق بھی بگڑ سکتے ہیں، ذہنی پریشانی الگ۔ میں تو کہوں گا بڑوں کو بھی نہیں پڑھنا چاہیے۔ گھن آئے گی پڑھ کر۔ شرفا کا کام

نہیں ایسی چیزیں دیکھنا۔''

وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''اس میں لکھا ہے کہ فلاں نے یہ کیا... فلاں نے وہ کیا... اور کیسے ہوا... لاحول...''

اب مہمان آنے لگے۔ کھانا میز پر سج گیا۔ بچے تھک کر خاموش ہو گئے۔ مگر انکل کی نصیحت جاری رہی۔

ماموں قریب بیٹھے تو انکل نے فوراً کہا:

''میں اسے سمجھا رہا تھا کہ ایپسٹین فائلز کبھی نہ پڑھنا۔ ظلم ہوا ہے۔ میں نے پڑھ لی ہیں۔ اب کیا کروں — توبہ توبہ...''

کچھ لوگ بچ کر نکل گئے، کچھ ان کے دامِ اظہار میں پھنس گئے۔ انکل ممنوعہ پھل کی لذت کا اعتراف بھی کرتے رہے اور اس سے بچنے کی تلقین بھی۔

شام گہری ہوئی۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ انکل بھی جانے کو اٹھے۔ میں انہیں دروازے تک چھوڑنے گیا۔ وہاں رک کر بولے:

''بیٹا، دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں جان کر انسان بدل جاتا ہے۔ میں بدل گیا ہوں، عجیب طریقے سے۔ نہیں چاہتا کہ تم اس انداز میں بدلو۔ اس لیے... کبھی نہ پڑھنا۔''

میں نے سر ہلایا۔ وہ چلے گئے۔

میں سوچنے لگا — کیا وہ جانتے ہیں کہ ان کی نصیحت نے دروازہ بند کیا ہے یا چوپٹ کھول دیا ہے؟ اور انھوں نے اتنی تفصیل بتائی کیوں؟ شاید وہ چاہتے ہیں کہ میں پڑھوں۔

رات کو کمرے میں آیا۔ موبائل میز پر پڑا تھا۔ اس کی اسکرین خاموش تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے مجھے دیکھ رہی ہو۔

میں نے موبائل اٹھایا۔ انکل کی آواز کہیں سے ابھری:

''بیٹا، کبھی نہ پڑھنا...''

اسکرین کھولی۔ سرچ بار روشن ہوئی۔

ایک لمحے کو نصیحت ذہن میں ابھری — پھر دھیرے دھیرے تحلیل ہو گئی۔

میں نے پہلا حرف دبایا:

''ای'' E —

نیم غنودگی میں سوچنے لگا — دنیا میں اور کتنی ممنوعہ چیزیں ہوں گی جن کا پہلا حرف ''ای'' ہو گا۔ انکل کا ''کبھی نہ پڑھنا'' کہیں اسی حرف تک پہنچنے کی دعوت تو نہیں؟

نیند غالب آ گئی۔

اسکرین پر اب کون سا لفظ ابھرا — غنودگی نے دیکھنے ہی نہ دیا۔

باہر عید کا دن شفق کے رنگوں کو الوداع کہہ کر افق کے پار ڈوب چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

بے نام رابطہ

آصف عمران

اپنی محبوبہ کی دید کو ترستی ہوئی آنکھیں، پریشان حال چہرہ، اور لیر لیر وجود کو مایوسی اور تھکاوٹ کے کمبل میں لپیٹے ہوئے ظفر اتنی آہستگی اور خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا کہ مجھے تو خبر ہی نہ ہوئی کیونکہ میں بھی افسانوں کی کتاب ''اہرامِ آرزو'' کے ایک افسانے ''اُداس آدمی کی کہانی'' کو اس طرح پڑھنے میں مگن تھا کہ اُس کے مرکزی کردار ''اُداس آدمی'' نے مجھے مکمل طور پر اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب موت رفتہ رفتہ اُداس آدمی کے چہرے پر اپنا سیاہ خیمہ تان رہی ہے تو وہ موت کو قطرہ قطرہ حلق میں اُتارنے کے باوجود اُس کے ذائقے کو کیوں بیان نہیں کر پا رہا۔ اسی لیے اُس کی کہانی نامکمل ہی رہتی ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنی زندگی بھی ناتمامی کی حالت میں گزاری تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کی ڈور ارد گرد کے واقعات، حادثات اور دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں دے رکھی تھی اور اپنی زندگی میں اپنے فیصلے خود نہ کر پایا۔ اسی لیے اُس کے خواب بھی ادھورے ہی رہے۔ دراصل اُس نے اپنے آپ کو ذاتی طور پر خوش رکھنے کے لیے محنت ہی نہ کی تھی مگر میری ذات سے اس طرح جڑا ہوا تھا کہ اُس نے میری خوشی کو اپنی خوشی جان لیا۔ میں اب سوچتا ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت کیوں نہ آئی کہ میں بھی اپنے خیالات اور جذبات سے اُس کو آگاہ کرتا اور وہ زندگی کو اپنی طرح جیتا۔ وہ انسانی زندگی اور موت کے مکالمے کو ایک سطر میں کشید کرنا چاہتا تھا اور میں حیرت سے اُس کے چہرے پر لہراتے ہوئے سایوں کو دیکھتا رہتا۔ اور اب بھی آنکھیں بند کیے اُداس آدمی کے حصار سے نکلنے کے لیے راستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ ظفر کی سگریٹ کا دُھواں میرے نتھنوں میں گھسنے لگا اور مجھے سانس لینے میں مشکل پیش آنے لگی تو میں نے آنکھیں کھول کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

میں بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ظفر کی حالت دیکھ کر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ آج کل وہ ہر وقت ایک عجیب سی کیفیت میں ڈوبا رہتا ہے۔ وہ مایوسیوں کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ تنہائی اور اُداسی کے گہرے سایوں نے اُسے گھیر رکھا ہے۔ اُس کے چاروں طرف ماحول میں اب سکوت ہی سکوت ہے جو پُرسکون نہیں بلکہ کرب انگیز

ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ وہ اپنی کہانی کا کوئی بڑا واقعہ بھول گیا ہے۔ زندگی کے سارے ہنگامے اُس کے لیے خاموش ہیں اور آوازیں بے صدا ۔۔۔ وہ بڑا اُلجھا ہوا واقعہ کیا ہے۔ گلی سے گزرتے ہوئے کب اُس نے دروازے کے کواڑ کی اوٹ میں کھڑی لڑکی کی نیلی اوڑھنی کے پلّو کو دیکھا تھا۔ کب لڑکی کے چہرے کا نقاب سرکا اور اُس کی نظریں لڑکی کے چہرے پر جم گئیں جہاں ایک سفید بے داغ وسعت میں شوخی میں ڈوبی ہوئی دو بڑی بڑی مسکراتی ہوئی آنکھیں جڑی ہوئی تھیں۔ جنھوں نے اُسے اپنی نظروں کے حصار میں قید کر لیا۔ کب لڑکی کی ایک جھلک اُس کے ذہن کی دیوار سے چپک گئی تھی وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا تو کئی چھوٹے چھوٹے واقعات اور نظارے اُس کے ساتھ چلنے لگتے۔ اگرچہ اُس کی کہانی میں ایک تسلسل ہے مگر یاد آنے کی بے ترتیبی میں بھی ایک خاص قسم کی ترتیب پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ اُس کی کہانی کا پورا سلسلہ ہی اُس کے ذہن میں گم ہو گیا ہے اور وہ اسے تلاش کرتے کرتے خود اپنی ذات کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ لڑکی کے چہرے پر سے سرکتے نقاب کا وہ لمحہ اُس کے ذہن میں منجمد ہو گیا ہے ۔۔۔ ایک لمحہ ۔۔۔ وقت کی مٹھی سے پھسل کر اُس کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھسلتا ہوا لمحہ خوف زدہ تھا۔ اُس کے اندر اُمید، آس، خواب اور نہ جانے کیا کیا تھا کہ دروازے کا کواڑ تھوڑا اور کھلا ۔۔۔ ایک جھلک پورے چہرے کی ۔۔۔ اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔

ظفر خاموش بیٹھا ہے اور مجھے دائیں طرف دیوار پر لگے آئینے میں اُس کا آدھا چہرہ نظر آرہا ہے ۔۔۔ اس کا اصلی رُوپ ۔۔۔ وہ نہایت ہی معمولی شکل وصورت اور گہرے بدشکل نین نقش والا ایک کم گو شرمیلا سا لڑکا ہے۔ تب میں نے اُسے اُس لمحے کی گرفت میں دیکھا جب وہ اپنے بدشکل چہرے اور بکھرے وجود کو دیکھ رہا تھا اور پھر اُمید اور آس کی ٹیپ سے اپنے وجود کو جوڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر اُس کے ذہن سے چپکی ہوئی لڑکی کی یاد اُسے رُلا دیتی ہے اور وہ یادوں کی برسات میں بھیگ جاتا ہے۔ ٹیپ بھی بھیگ کر اُدھڑ جاتی ہے اور اُس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بستر پر پھیلنے لگتا ہے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ نظر انداز کیے جانے کا عذاب جھیل رہا ہے۔ اُس کے اندر توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ وہ خود کلامی کی سی کیفیت میں بڑبڑانے لگا۔ ٹیلی فون پر وعدہ کرنے کے باوجود وہ آج پھر نہیں آئی۔ میں سدا بہار ہوٹل کے ہال کے ایک کونے میں میز پر چائے رکھے اُس کا انتظار کرتا رہا۔ میرے سامنے چائے کے دو کپ، چائے کے ساتھ سارے لوازمات، میز پر پڑے اُس کا انتظار کرتے رہے۔ میری نظریں

میں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ میرے چائے کے کپ سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ دوسرا کپ ابھی خالی تھا۔ اُسی طرح صاف شفاف جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ چائے کے کپ سے اُٹھتی بھاپ کے دوسری طرف وہ کرسی پر آ بیٹھی ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے بھاپ میں رینگتا ہوا دوسرے کپ میں اُتر جاتا ہوں۔ وہ اُس کپ سے گھونٹ گھونٹ چائے پی رہی ہے اور میں چائے کے ساتھ اُس کے دل میں اترتا جا رہا ہوں۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا جب ویٹر نے میز پر آ کر کہا: ''سر --- آپ کی چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ گرم چائے لاؤں۔'' میں نے آنکھیں کھولیں، اُسے غور سے دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ ''نہیں --- بل لے آؤ --- '' میں شرمندہ سا بل ادا کر کے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ پختہ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔ ایک سگریٹ سلگایا، پھر مایوسی اور بیزاری کے اندھیروں میں آگے بڑھتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اُسے اِس حال میں دیکھ کر میرے دل میں اُس کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھرنے لگے۔ میری ذات سے جڑے اُداس آدمی نے میری سماعت کی دیوار پر دستک دی اور سرگوشی کی کہ تمھارے دوست کو اِس وقت تمھاری ضرورت ہے۔ تم اُس کی زندگی میں اہم رول ادا کر سکتے ہو۔ خدا نے اُسے تمھارے ساتھ جوڑا ہے --- مگر میں تو پہلے ہی اُسے بکھرنے سے بچانے کے لیے اُس کے ساتھ وقت گزارتا ہوں، تاش کھیلتا ہوں۔ سگریٹ پیتا ہوں۔ گیت گاتا ہوں۔ اُس کی کہانی بار بار سنتا ہوں تاکہ اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ میں نے اُس کے وجود کے پنجرے میں اُس کی کھوکھلی رُوح کو دیکھا ہے اور رُوح میں بسی تنہائی کی گونج سُنی ہے اور جب وہ بہت اُداس ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ چائے پینے کے لیے ایک مخصوص ہوٹل میں چلا جاتا ہوں۔ اِس چھوٹے سے ہوٹل میں ہم تھوڑے سے پیسوں سے بہت سا عیش کرتے ہیں یا عیش کا تاثر حاصل کرتے ہیں۔ اسی عیش سے ظفر کی کہانی وابستہ ہے اور پھر اُداس آدمی نے میرے دل کی تاروں کو چھیڑا اور کہنے لگا دیکھو اگر تم آدمیوں اور فرشتوں کی زبانیں بولو اور محبت نہ رکھو تو تم ٹھٹھناتا پیتل یا جھنجھناتی جھانجھ ہو۔ سب بھید اور کل علم کی واقفیت اور کامل ایمان بھی رکھو اور محبت نہ کرو تو تجھے کچھ بھی فائدہ نہیں --- تم ظفر سے محبت کرتے ہو، اُسے احساس بھی دلاؤ۔ تب میں نے کتاب ایک طرف رکھی اور ظفر کی طرف متوجہ ہوا اور اُسے کہنے لگا:

ہاں ظفر ---- کہو، آج کیا ہوا ہے ---- کوئی خاص واقعہ ---- کوئی نئی بات ---- میں نے پیار سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا ---- نہیں ---- نہیں تم اِس طرح کرو کہ

اپنی محبت کی کہانی شروع سے سناؤ تاکہ میں اِسے افسانہ بنا کر لکھ سکوں۔ ظفر میں تمھیں چار سال سے جانتا ہوں یا شاید چار صدیوں سے ---- یا شاید تمھارے ہونے سے بھی پہلے سے ---- تم ایک خیالی دُنیا میں رہتے ہو۔ حقیقت سے دُور ---- اُس لڑکی کے چکر میں تم دُنیا سے کٹ جاتے ہو۔ تیرے شب و روز ایک عجیب عالم میں ---- عجیب کائناتوں میں گزر رہے ہیں۔ مگر تمھارا اکیلاپن مجھے پریشان کرتا ہے۔ تمھارا دھیان نہ اپنے آفس کی طرف ہے نہ اپنی صحت اور ذات کی طرف ---- اور نہ ہی بوڑھے والدین کی طرف اور نہ ہی میری طرف ---- آخر تم چاہتے کیا ہو ---- ایک معمولی لڑکی کی خاطر اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔ جسے شاید تمھاری پرواہ بھی نہیں ---- میں یہ کہہ کر غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

نہیں ---- نہیں ---- وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہے اور مجھے پیار بھی کرتی ہے ---- وہ میری ہیر ہے، سوہنی ہے، صاحباں ہے ---- سچ پوچھو تو وہ ان سب سے زیادہ خوبصورت ہے ۔ ظفر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ وہ جب ٹیلی فون پر بات کرتی ہے تو اُس کی آواز میں اُس کا بدن پھول کی طرح کھلتا ہے۔ اُس کے لفظ پھولوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اُس کی آواز تو کمرے کی بے جان چیزوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ میرے بدن اور روح کے خلیوں میں زیست بن کر تیرتی ہے۔ وہ پیکر تراشی کرنے لگا۔ وہ ایسی منظر کشی کرنے لگا کہ اُس کی محبوبہ کا ہیولا ہمارے سامنے سانس لیتا ہوا محسوس ہونے لگا اور وہ متشکل ہوتی چلی جاتی ہے۔ ظفر کہنے لگا اُس کی یاد میں میرا دل ایک دیے کی مانند جلتا رہتا ہے۔ میں اپنے آنسوؤں کے تیل سے اُسے روشن رکھتا ہوں۔ ظفر اپنی ہی دُنیا میں کھویا ہوا اپنی کہانی سنائے جا رہا تھا۔

دراصل ہوا یوں تھا کہ ایک دن میں آفس جانے کے لیے گلی کے کونے والے مکان تک پہنچا تو پہلی بار میں نے اُسے دروازے کے کواڑ کی اوٹ میں کھڑے دیکھا۔ اُس کے سر پر نیلی اوڑھنی تھی جس کا پلو کھلے کواڑ کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ شاید باہر گلی میں آنے کو بے تاب تھا۔ چہرے پر آدھا نقاب ---- چاند کا ٹکڑا بدلی کے پیچھے چھپا ہوا ---- دو شوخ آنکھیں چہرے پر مسکرا رہی تھیں۔ میرے قدم رُکے ---- میں نے نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ میرا دل سینے میں اُچھلا اور ذہن سُن ہو گیا۔ وہ بے انتہا خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کا رنگ گندمی مگر چہرے کی ساخت غضب کی تھی۔ آنکھوں میں گویا کوئی مقناطیسی قوت بھری ہو۔ چہرے کی ایک جھلک دیکھتے ہی میں اُس کی

نظروں کا اسیر ہو گیا۔ میں نے آنکھ کا اشارہ کیا تو وہ مسکراتی ہوئی دروازے کی اوٹ میں چھپ گئی۔ اور میں اُس وقت سے اُس کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ اُس کی نیلی اوڑھنی کا پلّو ہوا میں لہرا رہا ہے۔ نہ مجھے آگے بڑھنے دے رہا ہے نہ پیچھے ہٹنے دے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ میرے خوابوں کے کھیل میں شریک ہو گئی اور ایک دن میں نے موقع دیکھ کر کاغذ پر اپنا فون نمبر لکھ کر کاغذ کو اُس کے کے دروازے کے اندر اُچھال دیا۔ اور پھر ہر وقت فون کے اِنتظار میں عجیب سی کیفیت میں رہنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا ٹیلی فون نمبر اُس تک پہنچ چکا ہے اِسی لیے غیر اِرادی طور پر اُس کے فون کا انتظار کرتا رہتا۔ ایک دوپہر میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ موبائل فون پر مس کال نے متوجہ کیا۔ نمبر دیکھا --- اجنبی تھا۔ جب اکثر رانگ نمبر پریشان کرتے ہوں تو ان پر توجہ دینا ضروری نہیں ہوتا--- دس منٹ بعد دُوبارہ اُسی نمبر سے مس کال آئی۔ میں نے سوچا کہیں یہ مس کال نیلی اوڑھنی والی لڑکی کی ہی نہ ہو --- یہ سوچ کر فیصلہ کیا کہ اگر اب اس نمبر سے کال آئی تو ضرور سنوں گا۔

شام ڈھلے میں گھر پہنچا ہی تھا تو میرے موبائل فون نے زور سے سانس لیا اور رنگ ٹون بجنے لگی۔ فون اٹھایا۔ نمبر مس کال والا ہی تھا۔ کال آن کی تو دوسری طرف سے ایک سُریلی آواز میں دھماکہ ہوا۔

آپ نے فون رابطے کے لیے رکھا ہے یا صرف رنگ ٹون سننے کے لیے --- میں اس بے تکلفی پر حیران رہ گیا۔

جی آپ کا تعارف --- میں نے مہذب انداز میں بات کی۔

نیلی اوڑھنی والی - آپ سے رابطہ رکھنا چاہتی ہوں --- اُس کی سریلی آواز میری سماعت کی دیوار پر نقش ونگار بنانے لگی۔

بغیر تعارف کے رابطہ کس کام کا --- میں نے لہجے کو نرم ہی رکھا۔ میرے ذہن میں نیلی اوڑھنی کا پلّو لہرانے لگا۔

میرا رابطہ بامعنی ہے۔ آپ خوش رہیں گے۔

میں سمجھا نہیں --- میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

جب دل میں جھانکیں گے تو سمجھ جائیں گے۔ اور ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ اُس کی سُریلی آواز سننے کے بعد میری سماعت کی دیواروں پر تو خوشیوں کے پرندے چہچہانے لگے۔ دل میں پھول کھل اُٹھے کہ نیلی اوڑھنی والی نے آگے بڑھ کر اپنے دل کا دروازہ کھول دیا ہے اور پھر فون پر رابطوں کے ندی نالے بہنے لگے۔ ایک دن اُس نے بتایا کہ شام کی چائے وہ اپنے کمرے میں پیتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب میں اپنی تنہائی سے ہم کلام ہوتی ہوں۔ میرے سامنے چائے کے دو کپ ہوتے ہیں۔ ایک میرے لیے --- اور دوسرا--- میں اپنے سامنے رکھے کپ میں

ڈوب جاتی ہوں۔ کیا کبھی آپ میری تنہائی کو چائے کے اس کپ میں ڈوب کر بانٹ سکتے ہیں---- ایک سرد آہ کے ساتھ فون بند ہو گیا۔ میں سوچتا کہ نہ جانے وہ کیسے دُکھ اور کیسی تنہائی جھیل رہی ہے۔ اُس کا فون آتا تو میری رگوں میں زندگی تیرنے لگتی۔

میں اکثر اُسے شام کی چائے کے لیے سدا بہار ہوٹل میں بلاتا - ہر تیسرے چوتھے دن وہ آنے کا وعدہ کرتی مگر خود نہ آتی بلکہ مجبوری کی کہانی سنا دیتی۔ میں ہوٹل میں دو کپ چائے کے رکھ کر اُس کا انتظار کرتا۔ وہ خود نہ آتی مگر اُس کا خیال آ جاتا۔ وہ اپنا کپ خالی چھوڑ کر نہ جانے کہاں کھو جاتی ---- اور میری ملاقات اُدھوری رہ جاتی - وہ میری روح کا جڑواں ساتھی ہے۔ میرے دل میں بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ ہنستی ہے۔ ناراض ہوتی ہے مگر میں اُسے منا لیتا ہوں۔ ہر ناراضی کے بعد اُس کی آن لائن فرمائش معیار اور مقدار میں بڑھ جاتی ہے۔ میں اُسے پورا کرتا ہوں کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں - ظفر کو کہانی سناتے ہوئے دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ اُس کی اپنی محبوبہ کی دید کو ترستی ہوئی پیاسی آنکھیں، پریشان حال اُجڑا ہوا چہرہ اور بکھرے ہوئے وجود کے اندر مایوس دل کے پیالے میں ایک عاشق کی سی تکلیف وہ اذیت پنہاں چھلک رہی ہے۔ وہ خاموش ہوا تو ہمارے درمیان خاموشی کی بساط بچھ گئی۔ اس بساط پر مہروں کی چند چالوں سے مجھے ظفر کی محبت کی کہانی سمجھ آ گئی۔ اُس لڑکی کی وعدہ خلافی کے باعث آج بھی ملاقات نہ ہونے کے باعث ظفر کی اُمیدیں ٹوٹ رہی ہیں۔ خواب بکھیر رہے ہیں۔ اُس کی زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہو رہا ہے۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح تو وقت کی اینٹ جدائی کی دیوار سے سرک جائے اور نیلی اوڑھنی والی لڑکی سے ملاقات کا کوئی سبب پیدا ہو جائے جو اُس کی پلکوں میں بسی ہے جہاں صرف سپنے بستے ہیں جو اُس کے دل میں صرف کرائے دار کی طرح رہتی ہے مگر ناکامی نے اُسے اداسی کے گہرے سمندر میں پھینک دیا۔

اب میں ظفر سے کیا کہتا---- وہ تو اس لمحے یہاں موجود ہی نہیں تھا۔ کہاں تھا۔ نہیں معلوم۔ شاید وہ تنہائی کا صحرا پاٹنا چاہتا ہے۔ وہ لڑکی ظفر سے محبت کرتی ہے --- کم از کم ظفر کا یہی خیال ہے۔ مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ظفر کا وہم ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ صرف ظفر کے جذبات سے کھیل رہی ہے۔ وقت گزاری کے لیے ٹیلی فون پر بے نام رابطہ --- اپنی ضروریات کے لیے اُس کا استعمال --- ہمیشہ ملاقات سے انکار ---- مگر وہ یہ سب سمجھنے کے لیے

تیار نہیں ---- میں نے ہمت کر کے ظفر کو سمجھایا کہ لڑکیاں اتنی سیدھی نہیں ہوتیں۔ اگر سیدھی ہوتی تو شاید وہ زیادہ سچی ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھو۔ ظفر جس سے تم کبھی ملے نہیں ہو ---- اُس کے نام سے واقف نہیں ہو ---- اُسے اپنے دل میں بسا کر زندگی کو اذیت ناک کیوں بنا رہے ہو ---- دیکھو زندگی کے اپنے بھید ہیں۔ زندگی کی خوراک ٹھہرے سمندروں کا سکوت نہیں بلکہ قیامت خیز ہنگاموں میں اس کے عارضی ہونے کے دُکھ کا روگ ہے۔ ظفر نے بے زاری سے جمائی لی اور چہرے پر بے نیازی کا خول چڑھا کر آہستہ سے کہا تو پھر کیا کروں میں ---

چلو چھوڑو اِن باتوں کو ---- باہر چلتے ہیں۔ کھلی فضا میں دل بہل جائے گا۔ ظفر نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنے لگا اور باہر جانے کو راضی ہو گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے نکل کر گہری ہوتی شام کی چادر اوڑھ کر فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ سڑک پر ٹریفک بہت کم تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر ظفر سے کہا نظر اُٹھا کر چاروں طرف پھیلے آسمان کی طرف دیکھو۔ جہاں سے سورج، چاند، ستارے صدیوں سے رُوئے زمین پر زندگی کا تماشا بڑے انہماک سے دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ علم نجوم کے مطابق وہ خود بھی بٹی ہوئی رسّی کے ریشوں کی طرح انسان سے وابستہ ہیں۔ آسمانوں پر اُن کی اُٹھک بیٹھک، تال، حرکت، سکوت اور انگڑائی سے زمین پر انسانوں کی زندگیوں کے زائچے بگڑ بگڑ کر سنورتے رہتے ہیں اور سنور سنور کر بگڑتے رہتے ہیں۔ مگر یہ بھید آج تک نہیں کھل سکا کہ کس فرد کی زندگی صراطِ مستقیم ہوگی، کس کی ٹیڑھی لکیر اور کس کی گنجلک در گنجلک بھول بھلیوں میں گم ---- کون، کب اور کیسے مسرتوں سے ہم کنار ہوگا یا المیوں سے جا ٹکرائے گا۔ اِس حیرت کدے میں خوشی غمی کی بجلیاں کیوں اچانک چمکتی ہیں اور ان کا مقصد کیا ہوتا ہے ---- ایسے کئی سوالات کائنات کی وسعتوں میں صدیوں سے آوارہ بھٹک رہے ہیں۔ رہا تمھارا سوال کہ میں کیا کروں ---- اس کا جواب بھی تمھیں جلد مل جائے گا۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔

چلتے چلتے ہم سدا بہار ہوٹل کے سامنے پہنچے تو میں نے کہا کہ چلو ایک کپ چائے ہو جائے۔ میں نے شام کی چائے نہیں پی تھی۔ ہم ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہاں خاصا رش تھا۔ ظفر نے اپنی مخصوص میز کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک خوش شکل سُرخ و سپید رنگت والا جدید فیشن کا سمارٹ لباس زیب تن کیے لڑکا اپنے کانوں سے آئی فون لگائے کسی سے محوِ گفتگو تھا۔ مجھے وہ کوئی ماہر شکاری لگا۔ اس کی میز پر دو آدمیوں کی

چائے اپنے تمام لوازمات کے ساتھ موجود تھی اور ساتھ ہی قیمتی برانڈ کی سگریٹ کا پیکٹ، اُس کی ہونڈا گاڑی کی چابی اور اُس کا ٹیبلٹ اُس کے سامنے کپ کے ساتھ پڑا تھا۔ چائے کے کپ سے بھاپ اُڑ رہی تھی اور شاید وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم کوئی خالی میز دیکھنے لگے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ نہ جانے کیوں ظفر کچھ پریشان سا ہو گیا تھا اور میری ذات سے جُڑا ہوا اُداس آدمی مجھ سے جُدا ہو کر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس لڑکے کی میز کی طرف بڑھنے لگا۔ کچھ دوری پر ہم بھی ایک خالی میز بیٹھ گئے۔ ویٹر آیا اور چائے کا آرڈر لے کر آگے بڑھ گیا۔ ظفر نے ایک نظر اُس مخصوص میز کی طرف دیکھا اور کہنے لگا کہ میری آج تک اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اُس کا نام تک نہیں جانتا اور وہ اس تعلق کو بے نام ہی رکھنا چاہتی ہے۔ مگر آن لائن تحائف کا سلسلہ اور فون پر گھنٹوں باتوں کے واقعات ہماری محبت کی مکمل کہانی ہیں۔ میری کہانی میری ذات کا وہ مکالمہ ہے جو وقت، خواب، خاموشی اور ہوائی رابطوں کے استعاروں میں لکھا گیا ہے جو اپنے دائرے میں پوری کائنات رکھتا ہے --- ظفر نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اپنی محبت کے سارے حقائق کا پردہ چاک کر دیا۔ سچائی کا اقرار اُسے فریب کے بندھن سے آزاد کرنے لگا۔

تم ٹھیک کہتے ہو میں نے اُسے تسلی دی۔ حقیقی محبت کی کہانی زندگی کو تازہ دم کرتی ہے۔ وجود کو توانائی دیتی ہے۔ محبت صابر ہے۔ مہربان ہے۔ حسد نہیں کرتی بلکہ سب کچھ سہہ لیتی ہے اور جو کچھ منکشف کرتی ہے وہ دُنیا نہیں بلکہ وہ خود ہوتی ہے جو دُنیا دیکھ رہی ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اب ظفر خوابوں سے نکل کر وقت کی حقیقی تختی پر اپنی کہانی لکھ رہا ہے۔ اچانک ظفر کرسی سے اُچھلا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔ وقت کی دیوار سے ایک اینٹ اپنی جگہ سے سرکی۔ ایک لمحہ وقت کی مٹھی سے پھسل کر فرش پر گرا --- پھسلتے لمحے میں خوشی تھی، خوف تھا --- آس تھی اور نہ جانے کیا کیا --- وہ آ رہی ہے --- ظفر خوش تھا۔ حیران تھا کہ بغیر بتائے کیسے آ گئی۔

کون --- میں نے سوال کا غبارہ ہوا میں اُچھالا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

وہی نیلی اوڑھنی والی --- میری محبوبہ۔

ایک لمحہ --- صرف ایک لمحہ --- وہ ہماری میز کے پاس سے ظفر کو نظرانداز کرتی ہوئی گزری اور مسکراتے ہوئے سمارٹ لڑکے کے پاس پہنچ گئی۔ ظفر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ بددلی سے کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ ظفر کی محبت نہیں تھی اور ظفر زندگی کے اس ٹھہرے ہوئے بدصورت لمحے کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑنے لگا۔ مجھے ظفر کا چہرہ تپتے سورج میں اُس زمین کی طرح نظر آیا جس زمین پر

برسوں بارش نہ برسی ہو۔ وہ لڑکی جو ظفر کی ساری کائنات تھی، اب ایک دوسرے لڑکے کے سامنے بیٹھی ہے۔ میں اس سارے کھیل میں حیران پریشان کبھی ظفر کو دیکھتا ہوں اور کبھی اُس لڑکی کو۔ کیونکہ ان دونوں کا کوئی میل نہ تھا۔ نہ ظاہری نہ باطنی --- نہ شکل وصورت کا نہ عمر کا --- نہ سماجی حیثیت کا --- وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے دوست کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ تب میں نے محسوس کیا کہ اُس لڑکی کو دیکھ کر اور بات کر کے وہ لڑکا پریشان ہو رہا تھا شاید اُسے پہلی بار مل رہا تھا اور اُس کے چہرے کو پڑھ چکا تھا۔ میں نے جان لیا کہ میری کہانی کا اُداس آدمی اُس لڑکے کے ذہن میں جما بیٹھا ہے۔

تب ظفر نے گہرا سانس لیا اور اپنے سارے غم جھولی میں سمیٹ کر سگریٹ کے پیکٹ سے آخری سگریٹ نکالی اور سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیا اور دھواں ہوا میں اُڑاتے ہوئے اپنے دُکھ اور مایوسی کے کمبل کو وجود سے اُتارتے ہوئے کہنے لگا کہ میں آج تک یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ مجھ نہایت معمولی شکل و صورت بلکہ بدصورت آدمی سے بھلا کوئی خوبصورت نوجوان لڑکی محبت کیسے کر سکتی ہے۔ وہ تو فون پر باتوں کے ذریعے اپنی تنہائی کے جنگل کو کاٹ کر اپنا راستہ بنا رہی تھی مجھ سے وقت گزاری کے لیے کھیل رہی تھی۔

میں پہروں سوچتا رہتا، اپنے آپ سے اُلجھتا رہتا کہ آخر وہ مجھ سے ملتی کیوں نہیں --- یہی کڑی میری کہانی سے غائب تھی جسے میں ہمیشہ بھول جاتا تھا۔ آج سمجھا ہوں کہ وہ مجھ سے ملتی بھی تو کیسے --- میری تخیلاتی محبت کی کہانی تو صرف میرے ذہن کی پیداوار تھی۔ ظفر نے سگریٹ کا خالی پیکٹ موڑ توڑ کر ڈسٹ بِن میں پھینکتے ہوئے کہا: میری کہانی تو اب شروع ہوئی ہے۔ میں فریب کے جنگل سے نکل کر حقیقت کے میدان میں زندگی کے نئے کھیل کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے ظفر نے محبت اور اُمید سے بھری نظروں سے مجھے یوں دیکھا جیسے میں ہی اُس کی زندگی کا محور ہوں اور اُس کی ساری خوشیاں مجھ سے شروع ہو کر مجھ پر ہی ختم ہوتی ہیں۔ میرے دل میں خوشی کے پھول کِھل اُٹھے اور اُس کی محبت میرے دل میں اس طرح بچھ گئی جیسے کسی پرانے مزار پر تازہ پھولوں کی چادر --- نئی اُمید اور خوشی کے ساتھ --- ہماری نظریں چار ہوئیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے ظفر کا ہاتھ پکڑا اور ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا کہ تقدیر بھی انسان کے ساتھ کیا کیا کھیل کھیلتی ہے اور گھر کی طرف چل دیئے۔

☆☆☆☆☆

ٹیڑھا الف

ہر طرف اسکرینیں تھیں۔ رنگ تھے۔ حرکت کرتی ہوئی روشنیاں تھیں۔ منور بیگ کو کبھی کبھی لگتا تھا جیسے وہ کسی سمندر کے اندر بیٹھے ہیں جہاں پانی نہیں ہے مگر صرف پکسلو ہیں۔ آج یہ سمندر پہلے سے زیادہ گہرا لگ رہا تھا۔

منور بیگ نے بائیں ہاتھ کی ایک ہلکی سی جنبش سے فضا میں تیرتے ہوئے ہندسوں کو ایک طرف ہٹایا۔ عینک کے شیشوں پر روشنی مسلسل بدل رہی تھی۔ یہاں لاکھوں لوگ تھے مگر کوئی آواز نہیں تھی۔ داد ملتی تھی مگر ہاتھ نہیں ملتے تھے۔ عجیب ہجوم تھا جو ہمیشہ قریب رہتا تھا اور ہمیشہ دور۔ مگر آج منور بیگ نے سکرین پر ابھرنے والی ان لکیروں کو ایک بار بھی نہیں پڑھا۔

وہ اس ورچوئل کائنات کے سب سے معتبر اور سب سے مقبول خطاط تھے۔ آج لاکھوں نظریں ان کے کینوس پر تھیں مگر منور بیگ کے ذہن میں ایک ہی چہرہ تھا۔ وہ چھوٹا سا چہرہ جو تیس برس پہلے لاہور کی اس تنگ و تاریک گلی میں ان کے مکتب پر دوسرے شاگردوں کی طرح ہر صبح آتا تھا۔ یوں تو سب شاگرد ہی منور بیگ کو پیارے تھے مگر ان میں سب سے چھوٹا کامران ان کا پسندیدہ تھا۔ کامران کا لکڑی کے قلم کو پکڑنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی پرانی روح نئے جسم میں اتری ہو۔ اس کی عادت تھی کہ وہ ہر چند منٹ بعد آستین سے اپنی ناک صاف کرتا تھا۔

سردیوں کی ایک شام مکتب میں بجلی چلی گئی۔ باقی لڑکے شور مچاتے ہوئے باہر نکل گئے مگر کامران اپنی تختی پر جھکا بیٹھا رہا۔

’’گھر نہیں جانا؟‘‘

منور بیگ نے پوچھا۔

کامران نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

’’ابھی نہیں استاد جی--- یہاں روشنائی کی خوشبو ہوتی ہے۔‘‘

اس دن پہلی بار منور بیگ کو محسوس ہوا تھا کہ یہ لڑکا صرف حرف نہیں سیکھ رہا۔

منور بیگ نے ’’الف‘‘ کی ساخت سکھاتے وقت کامران کے ننھے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

’’بیٹا! یہ حرف نہیں ضمیر ہے۔ یہ ہمیشہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے جیسے انسان اپنے خالق اور اپنے ضمیر کے سامنے کھڑا ہو۔‘‘

مگر کامران ابتدا میں ہمیشہ ٹیڑھا سا ’’الف‘‘ بنا دیتا تھا۔

ایک بار کامران نے شرارت سے کہا۔

’’استاد جی یہ سیدھا الف اتنا مشکل کیوں ہے؟ ذرا ترچھا ہو تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔‘‘

مگر کامران اب خود کسی بڑے شہر میں استاد تھا۔ منور بیگ کو یاد نہیں تھا کہ آخری بار اس سے کب بات ہوئی تھی۔ شام کے سائے جب اتر

عمران امین

رہے تھے تو کہیں سے روشنائی کی دھندلی سی خوشبو آئی یا شاید یہ منور بیگ کا وہم تھا مگر اسی وہم میں کہیں کامران کی ہلکی سی شبیہ ابھری۔

آج تو کامران کا جنم دن ہے۔

پندرہ برس پہلے جب منور بیگ سے اجازت لے کر کامران دوسرے شہر گیا تو اس نے ہر عید اور جنم دن پر خط لکھا تھا۔ پھر خط ختم ہوئے، پیغامات آئے پھر پیغامات بھی ہولے ہولے خاموش ہو گئے۔

کامران کا ڈیجیٹل نام ''خطِ نستعلیق نو'' تھا۔ پچاس ہزار پیروکار تھے۔ منور بیگ نے ایک بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور اس کی ایک تخلیق پر دل کا نشان دبایا۔

مگر کامران نے جواب میں صرف لکھا ''شکریہ سر''

جواب کے ساتھ، چمکتا دل جو شاید پلیٹ فارم خود لگا دیتا تھا۔ منور بیگ دیر تک اس دل کو دیکھتے رہے پھر اس دل میں ان کی بیٹی ثمرہ کی شبیہ ابھری۔ انہیں یاد آیا کہ ان کی اپنی بیٹی ثمرہ نے پچھلی عید پر فون کیا تھا۔ سکرین پر اس کا چہرہ تھا۔ آنکھوں کے گرد ہلکی لکیریں اتر آئی تھیں۔ پسِ منظر میں کسی بچے کے رونے کی آواز تھی۔ تو ثمرہ نے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا ''خاموش ہو جاؤ۔ مجھے ابا سے بات کرنے دو''۔ پھر منور بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''ابا کیمرہ اوپر کریں ---اور اوپر''--- منور بیگ نے موبائل سیدھا کیا۔ ''لگتا ہے کھانا پھر کم کیا ہوا ہے''۔ انہوں نے سوالات سے گھبرا کر اپنے اوتار کو آگے کر دیا اور کہا'' میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا''۔ پھر سکرین بند ہو گئی۔ منور بیگ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ جھریوں اور دھبوں والے ایسے ہاتھ اوتار کے پاس نہیں تھے۔

منور بیگ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ کافی دیر سے پانی کا گلاس سامنے رکھا تھا مگر انہوں نے اٹھایا نہیں تھا۔

ان کی انگلیوں کے پوروں پر اب وہ پرانا کھردرا پن بھی نہیں تھا جو کبھی کچے کاغذ اور کالی روشنائی کے ملاپ سے پیدا ہوتا تھا۔ اب تو بس ہاتھ ہوا میں ہلتا تھا اور حرف خود بخود ڈھل جاتے تھے۔ مگر چکا چوند کے مرکز میں بیٹھ کر بھی ان کے اندر ایک برفیلا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

ان کے تازہ شاہکار پر لاکھوں نظریں تھیں۔ واہ کا ایک نہ تھمنے والا سیلاب تھا مگر اسی لمحے خیالوں کا ایک تانا بانا ان کے ذہن کے نہاں خانے سے نکلا۔ استاد مرحوم کہتے تھے منور میاں! لکھتے ہوئے حرف کی سیاہی کے ساتھ ساتھ صفحے کی سفیدی کو بھی اتنی ہی عزت دینا کیونکہ سیاہی تو صرف ایک حد ہے اصل کائنات تو اس خاموش سفیدی میں چھپی ہے۔ اگر اس باطن کو نہ پہچانا تو تمہارا الف ہمیشہ ٹیڑھا ہی رہے گا''۔ استاد سچے تھے۔ وہ مٹی کی دنیا کے خطاط تھے جہاں کاغذ کی اپنی خوشبو ہوتی تھی جہاں روشنائی سوکھنے میں وقت لیتی تھی اور انسان کو اپنی خطاؤں پر شرمندہ ہونے کا موقع ملتا تھا۔ انہوں نے دستانہ اتارا اور اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو

دیکھا-اچانک ذہن میں ایک پرانا منظر سجا-وہ دن جب کامران نے پہلی بار تختہ مشق پر "اللہ" لکھا تھا- کالی روشنائی کچے کاغذ کے ریشوں میں آہستہ آہستہ اتری تھی اسے سوکھنے میں چند منٹ لگے تھے جیسے لفظ کو اس کائنات میں سانس لینے کا موقع مل رہا ہو-اب منور بیگ نے سکرین پر ابھرتے ہوئے لفظ "اللہ" کو دیکھا-ایک ہی لمحے میں سینکڑوں نئی صورتیں سامنے آ رہی تھیں- ہر لفظ مکمل- ہر خم درست- منظر کی سحر انگیزی سے متاثر ہو کر انہوں نے بے اختیار ہاتھ آگے بڑھایا جیسے روشنائی کے سوکھنے کا انتظار کر رہے ہوں-

مگر اگلا لفظ پہلے ہی آ چکا تھا-

کون پڑھتا تھا انہیں؟ سب تو بس ایک انگلی سے دل کا نشان دبا کر آگے بڑھ جاتے تھے-

انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا-باہر مادی دنیا میں شام کا اداس اندھیرا اور سناٹا تھا-ایک ایسا سناٹا جس سے اب انہیں خوف آتا تھا-وہ دوبارہ سکرین کی طرف مڑے-وہاں ان کا جوان ڈیجیٹل اوتار لاکھوں لوگوں کے سامنے مسکرا رہا تھا-وہ اوتار جو کبھی بوڑھا نہ ہوتا اور نہ کبھی مرتا-

"تو پھر میں کون ہوں؟" منور بیگ نے اپنے سائے کو دیوار پر لرزتے دیکھا تو خود کلامی کی "-وہ جو اسکرین پر لافانی ہے یا وہ جو اس کرسی پر بیٹھا ہے؟"

اسی دوران اسکرین کے ایک کونے میں ایک پرانا نوٹیفکیشن ابھرا نظر آیا-

"خطِ نستعلیق نو wants to connect".

منور بیگ چند لمحے ساکت رہے- پھر رابطہ کھول لیا-

کامران کا چہرہ سامنے تھا-بالوں میں سفیدی اتری تھی مگر ناک اب بھی بات کرتے ہوئے ہلکی سی سکڑتی تھی-

"استاد جی"...

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا-

پیچھے شاید کچھ لوگوں کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی-

منور بیگ نے پہلی بار محسوس کیا کہ دونوں کے درمیان اب الفاظ نہیں صرف وقت بیٹھا ہے-

"آپ ابھی بھی ہاتھ سے لکھتے ہیں؟"

کامران نے دھیرے سے مسکرا کے پوچھا-

منور بیگ نے میز پر پڑی خشک دوات کی طرف دیکھا-

"کبھی کبھی"-

منور بیگ ابھی نوٹیفکیشن میں مصروف تھے کہ اسی لمحے اس چمکتی سکرین پر نوٹیفکیشنز کی ایک تیز لہر آئی- ان کے تازہ شاہکار کے عین سامنے ایک شبیہ "خطِ نو" نے اپنا چمکدار کینوس کھول دیا تھا-اس کے نیچے تبصروں کی ایک لمبی قطار نظر آ رہی تھی- تبصروں میں کسی نے لکھا-

"sirLegend"

اور اسی کے نیچے "اب AI سے آگے کون جائے گا؟"

منور بیگ نے اس تبصرے کو دوبارہ پڑھا-

"sir Legend"

پھر نیچے والا جملہ پڑھا۔ دونوں ایک ہی سانس میں لکھے گئے تھے۔ انہوں نے اسکرین سے نظر ہٹالی۔

منور بیگ نے دستانہ پہنا اور جواب لکھنے کا ارادہ کیا۔ الفاظ ذہن میں آئے مگر رک گئے۔ کیا لکھتے؟ ان کا ہاتھ اٹھا۔ رکا۔ انگلیاں کانپیں۔ الفاظ آئے مگر کہیں درمیان میں ہی ڈوب گئے۔ ان کا ہاتھ کسی کوڈ سے نہیں ہارا مگر الفاظ نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بالکل ویسے جیسے ثمرہ نے چھوڑا تھا اور کامران نے چھوڑا تھا۔ انہوں نے آہستہ سے دستانہ اتار دیا اور ہاتھ میز پر رکھ دیے جیسے ایک بوڑھا سپاہی اپنی آخری جنگ کے بعد تلوار زمین پر رکھ دیتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہار گیا بلکہ اس لیے کہ اب جنگ بے معنی ہو چکی تھی۔ اس نے نظریں سکرین پر جمائیں تو دیکھا اس کینوس پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔

''استاد کا انداز اب پرانا ہو چکا ہے یہ دیکھیے ۔۔۔ اصل خطاطی۔''

اس کے نیچے ایک ایسی تخلیق تھی جسے کسی انسان نے نہیں لکھا تھا مگر وہ لکھی ہوئی تھی۔۔۔ مکمل، متوازن مگر بے روح۔ منور بیگ نے اس تخلیق کو غور سے دیکھا۔ دیر تک دیکھتے رہے۔ تخلیق واقعی خوبصورت تھی۔ حروف کا توازن، خطوط کا بہاؤ اور وہ نازک موڑ جہاں ایک حرف دوسرے میں سانس لیتا ہے سب کچھ درست تھا بلکہ بالکل درست اور ریاضیاتی طور پر بھی مکمل۔ انہوں نے سوچا کہ انہیں یہ سب سیکھنے میں کئی دہائیاں لگی تھیں مگر مشین نے شاید چند منٹ لیے ہوں گے۔

انہوں نے پوچھا۔۔ کیا کوئی فرق ہے؟

جواب ملا تو پھر پوچھا۔۔۔ کیا واقعی کوئی فرق نہیں؟

اب کی بار کوئی جواب نہیں آیا۔

انہیں یاد آیا کہ ایک بار استاد مرحوم نے کہا تھا ''منور میاں حرف لکھنے سے پہلے سانس لو۔ وہ سانس حرف میں اترتا ہے''۔

انہوں نے سوچا ''مشین کے بے سانس حرفوں اور سانس والے حرفوں میں کیا فرق ہوتا ہے''۔

پھر جواب نہ ملا تو منور بیگ دیر تک اس تخلیق کو دیکھتے رہے جیسے کوئی آدمی آئینے میں اپنا ہی چہرہ دیکھے مگر آنکھیں کسی اور کی ہوں۔ دل کے نشانات اب وہاں اچھل رہے تھے۔ منور بیگ کے کینوس پر جو اکا دکا کھینیں رہ گئی تھیں وہ سب خاموش تھیں۔ منور بیگ نے جب یہ منظر دیکھا تو آہستہ سے ایک بار پھر اپنی نظریں سکرین سے پھیر لیں۔

انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے لمساتی دستانہ دوبارہ پہنا۔ ان کی انگلیوں نے ہوا میں حرکت کرتے ہوئے اس لافانی ڈیجیٹل کینوس پر ابھرے ہوئے اس گہرے شگاف کو چھونے کی کوشش کی۔ پلکیں تھرتھرائے۔ سکرین پر موجود بچے کھچے تماشائیوں کے کمنٹس کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ سب سمجھے کہ استاد اب اس توہین کا جواب دینے کے لیے کوئی نیا معجزہ دکھانے والے ہیں۔

انہوں نے انگلی اس سیاہ شگاف پر رکھ دی۔ کچھ لمحے وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ ان کی انگلی جیسے ہی

اس سیاہ شگاف سے ٹکرائی انہیں لگا کہ سیماب کا دوسرا رخ اب ان کے سامنے ہے۔ انہیں لگا جیسے سکرین کی جھوٹی چمک کا پردہ چاک ہو گیا ہو۔ سیماب — جو ایک عمران کی سکرینوں پر پکسلوں کی صورت لرزتا اور چمکتا رہا تھا اور جس کی متحرک روشنیوں کو وہ اپنا فن سمجھتے رہے تھے۔ آج اندر سے بالکل کھوکھلا نظر آ رہا تھا۔ یہ دوسرا رخ کسی لافانی اوتار کا نہیں تھا بلکہ اس چمک دمک کے پیچھے چھپی ابدی تنہائی اور بے معنی دنیا کا تھا جہاں مشین کے بنائے ہوئے لفظ تو زندہ تھے مگر انہیں لکھنے والا انسان مر چکا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی ساکت بیٹھے رہے۔ کچھ سوچ کر سکرین کے مین سوئچ پر ہاتھ رکھا مگر انگلی لرز کر رک گئی۔ ذہن کے بند دریچے سے ثمرہ کا وہ بچپن کا معصوم چہرہ جھانکا۔ جب وہ انہیں چوبی قلم پکڑے گھنٹوں دیکھتی اور کہتی تھی "ابا! آپ کا ہاتھ لکھتے وقت سانس لیتا ہے۔" انہوں نے اس وقت ہنس کر اس بات کو ٹال دیا تھا۔ آج عمر کے اس آخری حصے میں انہیں سمجھ آیا کہ اس بچی نے کیا دیکھا تھا۔

انہوں نے سکرین پر آخری نظر ڈالی۔ ان کا ڈیجیٹل اوتار اب بھی مسکرا رہا تھا ہمیشہ کی طرح مگر بلاوجہ۔ منور بیگ کے بوڑھے ہونٹ کانپے مگر چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں ابھری۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور روشنی کے اس پورے مصنوعی سمندر کو ایک زوردار جھٹکے سے اندھیرے میں ڈبو دیا۔

کھٹ کی آواز کے ساتھ ہی پورا کمرہ سیاہ ہو گیا۔ اب وہاں صرف بوڑھے خطاط کے ہانپتے ہوئے سانسوں کی آواز تھی۔ منور بیگ کافی دیر کرسی پر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر اپنے جھریوں زدہ ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا جیسے ان کھردری ہتھیلیوں میں سمٹی خطاطی کو محفوظ کرنا چاہتے ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ گلی میں کتا بھونک رہا تھا۔ انہیں محسوس ہوا جیسے دیوار پر ان کا سایہ ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھے۔ الماری کے نچلے خانے سے پرانی روشنائی کی دوات نکالی۔ ڈھکن پر زنگ لگا ہوا تھا۔ ایک پرانا چوبی قلم بھی ملا مگر نوک گھسی ہوئی تھی۔ وہ کرسی پر آ کر دوبارہ بیٹھ گئے۔ کاغذ نہیں ملا تو رسالے کا سفید حاشیہ ہی سامنے رکھ لیا۔ روشنائی خشک ہو چکی تھی۔ قلم ڈبویا تو بس ایک دھندلی اور کانپتی لکیر نکلی۔ قلم دوبارہ دوات میں ڈبویا۔ اس بار روشنائی ذرا سی زیادہ لگی۔ انہوں نے "الف" لکھنا چاہا۔

وہی الف جو ہمیشہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے جیسے انسان اپنے خالق کے سامنے کھڑا ہو۔ ہاتھ چلا۔ مگر ہاتھ کو یاد نہیں رہا تھا۔ قلم اور کاغذ کا ساتھ چھوٹے کتنے برس بیت چکے تھے۔ گنے تو یاد نہیں آئے۔

کاغذ پر ایک ٹیڑھا "الف" بنا۔

منور بیگ نے اسے دیر تک دیکھا۔ کامران بھی ایسا ہی الف بناتا تھا اس دن انہوں نے اسے ڈانٹا تھا... آج وہ خود---

انہوں نے قلم رکھ دیا اور کاغذ پر وہ ٹیڑھا الف--- نہ مکمل نہ ادھورا--- بس لرزتا ہوا۔

☆☆☆☆☆

گلوبل ولیج......

شہر کا ایک عام سا محلہ، جہاں شام ڈھلتے ہی زندگی ایک مخصوص، دھیمے اور پُرسکون ماحول میں ڈھل جاتی تھی۔ مسجدِ رضوان کا مینار آسمان کی گہری سیاہی میں ایک خاموش گواہ کی طرح کھڑا تھا، جس سے عشا کی اذان کی سوز بھری گونج ابھی حال ہی میں فضا میں تحلیل ہوئی تھی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد بھیڑ آہستہ آہستہ بکھر رہی تھی۔ کچھ لوگ اپنی اپنی منزلوں کی طرف گامزن تھے، تو کچھ محلے کی کسی چوکھٹ پر کھڑے دن بھر کی تھکاوٹ اتار رہے تھے۔

مسجد کے بیرونی صحن میں، جہاں نیم کا پرانا درخت اپنی شاخیں پھیلائے ہوئے تھا اور اس کا سایہ سڑک کی برقی روشنیوں سے مل کر زمین پر ایک دھندلا سا نقش و نگار سے مزین منظر بنا رہا تھا، حامد صاحب اپنے جوتے پہنتے ہوئے رُک گئے۔ سامنے مقبول صاحب کھڑے تھے، جن کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ تھا اور آنکھوں میں ایسی گہرائی، جس میں گزرے ہوئے وقت کی یادیں اور تجربات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مقبول صاحب کو اس محلے میں منتقل ہوئے کچھ عرصہ بیت چکا تھا، مگر حامد صاحب کے لیے وہ آج بھی ایک اجنبی ہی تھے۔

حامد صاحب، جو اپنی باتونی طبیعت کے لیے مشہور تھے، بات کا آغاز پُرجوش انداز میں کرتے ہوئے بولے، ''آپ کو پتا ہونا چاہیے، مقبول صاحب! آج دنیا واقعی ایک 'گلوبل ولیج' بن چکی ہے۔''

انھوں نے اپنے موبائل فون کی سکرین پر ایک نظر ڈالی، جو ان کی ہتھیلی میں جگمگا رہی تھی۔

''جناب! اس ٹیکنالوجی کی بدولت آج انسان کے پاس دوری کا کوئی تصور ہی باقی

رانا محمد شاہد

نہیں رہا۔ وہ زمانہ یاد کریں جب خطوط کے جواب کا مہینوں انتظار کیا جاتا تھا، یا پی ٹی سی ایل کے ٹیلی فون پر وقت لینے کے لیے گھنٹوں قطاروں میں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ آج بیٹا امریکہ میں ہو یا برطانیہ میں، ویڈیو کال پر یوں بات ہوتی ہے جیسے سامنے بیٹھا ہو۔ یہ ترقی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہر چیز انگلیوں کے اشارے پر ہے۔"

حامد صاحب نے اپنی بات کا اختتام ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کیا، گویا انھوں نے انسانی ترقی کا کوئی بڑا فلسفہ بیان کر دیا ہو۔

مقبول صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ ان کا چہرہ اس وقت کسی پرانی کتاب کی مانند لگ رہا تھا، جس کے اوراق پر تجربات کی ہزاروں سطریں ثبت ہوں۔ انھوں نے توقف کے بعد دھیمی مگر پُر اثر آواز میں کہا،

"آپ کی بات درست ہے، حامد صاحب۔ میں ٹیکنالوجی کی ترقی کا ہرگز انکار نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ نظر بھی آتا ہے اور محسوس بھی ہوتا ہے، مگر کیا ہم نے کبھی ٹھہر کر سوچا ہے کہ اس سہولت کی انسان کیا قیمت ادا کر رہا ہے؟ آج انسان نے ان پرزوں کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطے تو جوڑ لیے ہیں، مگر محبتیں اور رویے بھی انھی مشینوں کی طرح بے روح ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم نے دنیا کو تو سمیٹ لیا، مگر اپنے دلوں کے فاصلے بڑھا لیے ہیں۔ حقیقی خوشی، جو انسان کے دل کے اطمینان اور ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے میں تھی، اب ٹیکنالوجی کی اس چکاچوند اور 'لائیو' چیٹس کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی ہے۔"

حامد صاحب، جو ابھی تک اپنی ٹیکنالوجی کی تعریف کے نشے میں مگن تھے، مقبول صاحب کے اس فلسفیانہ تبصرے پر کچھ حیران ہوئے۔

"محبت؟ خوشی؟ جناب! خوشی کا سیدھا تعلق سہولت سے ہے۔ آج کی ٹیکنالوجی نے ہمیں وہ سہولت دی ہے جس کا ہمارے بزرگ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ ترقی کے ساتھ جینا سیکھے۔ آج ہم جتنی معلومات ایک دوسرے کے بارے میں اور دنیا کے کونے کونے کے بارے میں رکھتے ہیں، پہلے کبھی ایسا ممکن نہ تھا۔ یہی تو گلوبل ولیج کا تحفہ ہے، جہاں ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں۔"

وہ ذرا رکے، پھر بولے،

"اب دیکھیں، کل رات ہی کی بات ہے۔ میرا بیٹا، جو دبئی میں مقیم ہے، اس نے مجھے ایک ویڈیو کی، جس میں وہ اپنے دفتر کے

ایک کونے میں بیٹھ کر قہوہ پی رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے ساتھ ہی بیٹھا ہو۔ کیا یہ معجزہ نہیں؟ پہلے کئی کئی سال گزر جاتے تھے کسی پیارے کا چہرہ دیکھے بغیر۔ خط ملتے تھے تو ان کی سیاہی بھی دھندلا چکی ہوتی تھی، مگر اب تو ہر لمحہ ساتھ ہونے کا احساس رہتا ہے۔ کیا یہ ترقی انسانیت کے لیے ایک بڑی نعمت نہیں؟''

مقبول صاحب نے حامد صاحب کی آنکھوں میں گہرائی سے دیکھا، جیسے وہ ان کے اندر چھپی جدید انسان کی تنہائی کو پڑھ رہے ہوں۔ انھوں نے اچانک سوال کیا،

''اچھا، یہ تو بتائیے، حامد صاحب! آپ مجھے کتنا جانتے ہیں؟ ہم اکثر مسجد میں ملتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرے گھر میں کتنے افراد ہیں؟ یا کیا آپ نے کبھی میرے بارے میں پوچھنے، مجھے جاننے کی زحمت کی ہے؟''

حامد صاحب ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گئے۔ انھوں نے مقبول صاحب کے چہرے پر نظر ڈالی، پھر نظریں جھکا لیں۔ ہچکچاہٹ ان کی آواز میں نمایاں تھی۔

''دیکھیے...... آپ کو یہاں آئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے ہیں...... میں واقعی آپ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا...... شاید...... یہ میری ہی کوتاہی ہے۔''

مقبول صاحب کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ انھوں نے نیم کے درخت کی طرف دیکھا اور دھیرے سے گویا ہوئے،

''دیکھیے، یہی تو اس 'گلوبل ولیج' کا اصل المیہ ہے۔ ٹیکنالوجی نے ہمیں دنیا بھر سے تو جوڑ دیا۔ ہم ہزاروں میل دور بیٹھے شخص کی 'لائیو' تصویر دیکھ سکتے ہیں، مگر اپنے ساتھ رہنے والے انسانوں سے اتنا دور ہو گئے ہیں کہ تین ماہ سے ایک ہی محلے میں رہنے اور صبح و شام ایک ہی مسجد میں ملنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ یہی ہماری جدیدیت کی شکست ہے۔ ہم نے دور کی آوازیں تو سن لیں، مگر قریب بیٹھے انسان کی خاموشی کو نہ پڑھ سکے۔ کیا یہی ترقی ہے کہ ہم دنیا کو تو جان لیں، مگر اپنے پڑوسی کو نہ پہچان سکیں؟ یہ ٹیکنالوجی ہمیں ایک دوسرے سے جوڑنے کے بجائے اپنے اپنے خول میں قید کر رہی ہے۔''

وہ چند لمحے خاموش رہے، پھر بولے،

''کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ میں نے دیکھا، آپ کے گھر کے سامنے ایک بچہ گر گیا تھا۔ وہ کافی دیر تک روتا رہا۔ آپ کے گھر کی کھڑکی سے کچھ لوگ باہر دیکھ رہے تھے، مگر کوئی باہر نہیں آیا، کیونکہ سب اپنے فونز میں مگن تھے۔ شاید کوئی ویڈیو دیکھ رہا تھا یا کسی

سوشل میڈیا پوسٹ پر تبصرہ لکھ رہا تھا۔ کیا یہ گلوبل ولیج ہمیں ایک نئے پتھر کے دور کی طرف نہیں لے جا رہا، جہاں جذبات کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی؟"

حامد صاحب خاموش تھے۔ انھوں نے کچھ کہنا چاہا، مگر الفاظ گلے میں اٹک گئے۔ انھیں یاد آیا کہ واقعی اس دن وہ اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر بیرونِ ملک مقیم ایک دوست سے گفتگو میں مصروف تھے اور گلی میں روتے ہوئے بچے کی آواز کو نظرانداز کر گئے تھے۔

"حامد صاحب!" مقبول صاحب نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا، "پرانے وقتوں میں جب ہم اکٹھے بیٹھ کر چائے پیتے تھے تو ایک دوسرے کے چہروں پر لکھی خوشی اور غم کو پڑھ لیتے تھے۔ آج ہم نے چہرے پڑھنا چھوڑ دیے ہیں اور سکرینیں دیکھنا سیکھ لیا ہے۔ سکرینوں کی یہ روشنی اصل زندگی کی حرارت آہستہ آہستہ ہم سے چھین رہی ہے۔"

اسی لمحے مسجد کے صحن میں ایک عجیب سی بوجھل خاموشی چھا گئی۔ سڑک پر گزرتی گاڑیوں کا شور بھی جیسے اس تنہائی کو مزید گہرا کر رہا تھا۔

حامد صاحب، جو کچھ دیر پہلے مسلسل بول رہے تھے، اب بالکل خاموش تھے۔ مقبول صاحب کے سوالوں نے ان کے اندر ایک عجیب تلاطم برپا کر دیا تھا۔ ان کے پاس ٹیکنالوجی کے کمالات کی ایک طویل فہرست تو تھی، مگر انسانی تنہائی اور رشتوں کے بانجھ پن کا کوئی جواب نہ تھا۔

آس پاس کی دنیا گلوبل ولیج بننے کے خواب میں گم تھی، لیکن مسجد کے اس گوشے میں دو انسان اپنی اپنی سوچوں کے جزیروں پر تنہا کھڑے تھے۔

مقبول صاحب آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے، جبکہ حامد صاحب وہیں کھڑے اپنے موبائل کی سکرین کو دیکھ رہے تھے، جو اب انھیں کسی مشین سے زیادہ تنہائی کا آئینہ محسوس ہو رہی تھی۔

انھوں نے ایک نظر اس راستے پر ڈالی، جہاں سے مقبول صاحب چلے گئے تھے۔ شاید اب وہ مقبول صاحب کو تلاش کر کے ان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے، ان کے چہرے کو پڑھنا چاہتے تھے، مگر مقبول صاحب اندھیرے میں کہیں گم ہو چکے تھے۔

اس رات حامد صاحب نے پہلی بار محسوس کیا کہ انسان جب سکرینوں سے باتیں کرنے لگے تو چہرے خاموش ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

لائٹر

کافی کی سطح پر جمی ہوئی بالائی اس کی آنکھ کی پتلی پر جمے ہوئے سوال جیسی تھی۔ سامنے میز پر پڑا لائٹر وہ انگوٹھے کے ناخن سے بجا رہا تھا۔ جیسے کوئی مردہ رباب کے تار چھیڑ کر اس میں سے زندگی کی آس لگا بیٹھا ہو۔ پلاسٹک کا جسم پیلا پڑ چکا تھا، گیس کی ہچکیاں گنتی کی رہ گئی تھیں مگر چنگاری کی انا ابھی زندہ تھی۔

اسے سارہ کا وہ پہلا جملہ یاد آیا جب اس نے سگرٹ سلگائی تھی۔ سارہ نے دھواں ہوا میں چھوڑ کر کہا تھا:

تمھارے ہاتھ میں آگ بھی قرینے سے جلتی ہے--- جیسے شعلہ تمھاری انگلیوں سے تہذیب کا سبق لیتا ہو۔

بس--- اسی ایک فقرے کی خیرات پر وہ سات برس تک سارہ کا ذاتی سورج بنا رہا۔ وہ روتی تو وہ اس کی پلکوں کی نمی کو دھواں بنا کر اڑا دیتا۔ اسے سردی لگتی تو وہ اپنی ہتھیلی کی ساری حدت اس کے کانپتے لبوں پر وار دیتا۔ وہ سمجھا وہ اس کی عمر بھر کی روشنی ہے حالاں کہ وہ صرف اس کی سگرٹ کا لمحاتی شعلہ تھا۔

تبادلہ ہوا تو فاصلہ صرف شہروں کا نہیں بڑھا اس کے بخت کی لو بھی سرکنے لگی۔ شروع میں سارہ لکھتی رہی: تمھارے بغیر تمباکو بھی پھیکا لگتا ہے--- جیسے سگرٹ میں تمھاری انگلیوں کا نمک نہ گھلا ہو۔ وہ مغرور ہنسی ہنستا اور جواب دیتا! ماچس سے جی بہلا لو مگر یاد رکھنا--- تیلی ایک بار جلتی ہے اور لائٹر بار بار جیتا ہے۔ اسے وہم تھا کہ سات برس کی تپش کسی نئے موسم کی پھوار سے نہیں بجھتی مگر آج انسٹا گرام کی ایک تصویر نے اس کے وہم کا جنازہ نکال دیا۔ سارہ سمندر کنارے بیٹھی

شاہ روم خان ولی

تھی۔ سامنے کوئی شخص تھا۔۔۔ صاف ستھرا، نفیس، کلائی پر وقت کی قیمت بندھی ہوئی اور اس کے ہاتھ میں چاندی کا بھاری زپو تھا۔ سارہ اس سے سگرٹ سلگوا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں وہی سکون تھا جو کبھی اس کے سستے لائٹر کے لیے مخصوص تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا:

"ہر آگ اپنی اوقات کا شعلہ مانگتی ہے"۔

اس نے اپنا لائٹر مٹھی میں کسا اور چٹخایا۔ پہلی بار۔۔۔ صرف چنگاری، جیسے کوئی مردہ آنکھ بھڑک کر بند ہو جائے۔ دوسری بار۔۔۔ چنگاری اور ایک کڑوا دھواں، جیسے جلتے ہوئے خواب کی بو۔ تیسری بار۔۔۔ انگلی پر چڑ پڑا اور بس۔ شعلہ نہیں بنا۔ اس لمحے اسے لگا جیسے سات سال کی ریاضت، سات سال کی بندگی، سات سال کا دھواں۔۔۔۔ سب اس کی پوروں سے رِس کر میز پر راکھ بن کر بکھر گیا ہو۔

وہ اٹھا۔ لائٹر کو ایش ٹرے میں نہیں، اپنی ہتھیلی پر رکھا اور غور سے دیکھا۔ یہ لائٹر نہیں تھا۔۔۔ یہ اس کی اپنی قبر کا کتبہ تھا جس پر تاریخِ وفات لکھنی ابھی باقی تھی۔ ہوٹل سے نکلا تو گلی کے نکڑ پر کوڑے دان کا منھ کھلا تھا۔ اندر لائٹروں کا ڈھیر تھا۔۔۔ سب پچکے ہوئے، سب گیس سے خالی، سب کے جسم پر کسی نہ کسی کے انگوٹھے کے نشان۔ ہر لائٹر کسی کی رات، کسی کی بات، کسی کی ذات جلا کر خود کوئلہ ہو چکا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ کوئلہ ہو کر بھی ان سب کو یہی گمان تھا کہ وہ ہیرا تھے۔

اس نے جیب سے نیا لائٹر نکالا۔۔۔ ابھی بھرا ہوا، ابھی ان چھوا، ابھی خوش فہم۔ اس نے اسے کوڑے دان میں نہیں پھینکا۔ بل کہ آسمان کی طرف اچھال دیا۔ لائٹر ہوا میں گھوما اور فٹ پاتھ پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے لائٹر کو دیکھ کر سرگوشی کی:

مسئلہ گیس ختم ہونے کا نہیں تھا سارہ۔۔۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں لائٹر تھا ہی نہیں۔ میں تو صرف تمہاری سگرٹ کا وہ پہلا کش تھا جسے تم نے مزا لے کر دھوئیں میں اڑا دیا۔۔۔۔ اور اب میں سمجھا۔۔۔ آگ کا کام جلانا نہیں، راکھ بننا ہے۔۔۔ اور جو راکھ ہونا قبول کر لے، اسے پھر کوئی لائٹر، کوئی زپو، کوئی انسان۔۔۔ دوبارہ نہیں جلا سکتا۔

وہ مڑا اور چل دیا۔ پیچھے فٹ پاتھ پر بکھرا ہوا لائٹر اب لائٹر نہیں رہا تھا۔۔۔ وہ اس کی پرانی خودی کا جنازہ تھا جسے وہ اپنے قدموں سے روند کر آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

شکار کی قطار (علامتی مائیکروفکشن)

میمتھ کے شکار سے واپسی پر گوشت بانٹا جاتا تھا۔
پچھلے آتش فشاں کے پھٹنے کے بعد مرکزی غار کی دیوار پر خون اور کوئلے سے ایک اصول لکھا گیا تھا۔ اس دن سے گوشت لینے والوں کی قطار بننے لگی۔
بورا ہمیشہ سب سے آخر میں کھڑا ہوتا۔
ایک دن سردار نے پوچھا۔
"تم ہمیشہ آخر میں کیوں کھڑے ہوتے ہو؟"
بورا نے بے نیازی سے کہا۔
"سب پہلے آتے ہیں۔"
سردار کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔
"کل پہلے آنا۔"
اگلی صبح بورا منہ اندھیرے پہنچ گیا۔ غار کے باہر برف پر ابھی کسی پاؤں کا نشان نہیں تھا۔
سردار پہلے سے وہاں تھا۔
اس نے بورا کو دیکھا۔
"پیچھے جاؤ!"
"میں پہلے آیا ہوں۔"
سردار نے غار کی دیوار کی طرف دیکھا، جہاں کوئلے سے لکھی ہوئی سیاہ لکیریں اب بھی موجود تھیں۔
"تمھاری جگہ وہاں ہے۔"
بورا آخر میں جا کھڑا ہوا۔
کسی نے کچھ نہیں کہا۔
سال گزرتے گئے۔ بورا کے بال سفید ہو گئے۔ شکار کے بعد دھواں، خون اور پگھلی ہوئی برف کی بو، غار کے آس پاس پھیلی رہتی اور وہ ہر بار وہیں جا کھڑا ہوتا، جہاں اس سے پہلے کھڑا ہوا تھا۔
ایک دن ایک لڑکا اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا۔
"آپ ہمیشہ یہیں ہوتے ہیں؟"

سیدہ نیر کاظمی

بورا نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ادھر ہی کھڑا ہوتا ہوں۔"

"آپ کی باری کب آتی ہے؟"

بورا نے گوشت کاٹتے ہاتھوں کو دیکھا۔

"میرے بعد۔"

لڑکا ہنس دیا۔

شام تک ٹوکری خالی ہوگئی۔

سردار نے اسے الٹا کیا۔ آخری دو ہڈیاں بھی برف پر گر پڑیں۔

"آج آخر والے کے لیے کچھ نہیں بچا۔"

بورا نے سر ہلا دیا۔

گھر پہنچا تو بیوی الاؤ کے پاس بیٹھی تھی۔

اس نے خالی ہاتھ دیکھے۔ کچھ پوچھا نہیں۔

کچھوے کے خول میں پانی بھرا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"پی لو"

بورا نے پانی پیا۔

رات گئے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

وہی لڑکا تھا۔

اس کی مٹھی میں گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔

"آپ کے لیے۔"

بورا نے گوشت لیا۔ دیر تک اسے ہتھیلی پر رکھے دیکھتا رہا۔

"کہاں سے ملا؟"

لڑکے نے کہا۔

"میں قطار سے نکل آیا تھا۔"

بورا نے پہلی بار اس کی طرف غور سے دیکھا۔

صبح ہونے سے پہلے وہ اٹھ گیا۔

غار کے باہر پہنچا تو آسمان ابھی سیاہ تھا۔

آگ بجھی ہوئی تھی۔ دیوار پر خون اور کوئلے سے لکھی پرانی عبارت نمی میں پھیل کر ایک دھبہ بن چکی تھی۔

آج بورا سب سے پہلے پہنچا تھا۔

وہ قطار کے آگے کھڑا رہا۔

کچھ دیر بعد لوگ آنے لگے۔

مگر کسی نے اسے پہچانا بھی نہیں۔

بورا نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

میمتھ کا گوشت ابھی دور تھا۔

قطار بن رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

زنجیریں

شہر کی سب سے قدیم اور بھیگتی ہوئی گلی کے آخری کونے پر ایک بوسیدہ، زنگ آلود حویلی کھڑی تھی۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے گرد کی اتنی موٹی تہوں سے ڈھکے تھے کہ دن کی روشنی بھی اندر داخل ہوتے ہی اپنی رمق کھو بیٹھتی اور ایک بوجھل، زردی مائل اندھیرے میں بدل جاتی۔ اس حویلی میں سلیمان شاہ اکیلا رہتا تھا۔ اکیلا...... یا شاید اپنی بنائی ہوئی ان دیکھی دیواروں اور خود پر طاری کی ہوئی خوفناک تنہائی کے ساتھ۔

سلیمان شاہ ایک ایسا انسان تھا جس کے چہرے پر پڑی جھریوں میں ماضی کے ان گنت راز شکنوں کی صورت منجمد ہو چکے تھے۔ وہ شہر کے سب سے پرانے عجائب گھر کا نگران رہا تھا اور اب اپنی عمر کے آخری مرحلے میں اس حویلی کے تاریک کمروں میں یوں بستا تھا جیسے کوئی زندہ لاش کسی مقبرے میں سانس لے رہی ہو۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ پاگل ہو چکا ہے، لیکن اس کی آنکھوں میں ویرانی سے زیادہ ایک پراسرار چمک تھی— ایک ایسی چمک جو صرف ان لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے جنھوں نے کوئی ایسا سچ دیکھ لیا ہو جو باقی دنیا کی بصیرت سے اوجھل ہو۔

اس کی دنیا محض دو چیزوں تک محدود تھی: ایک پرانی، لکڑی کی وزنی آرام دہ کرسی اور وہ شے جس کی حفاظت وہ اپنی روح سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ اس کے کمرے کے عین وسط میں، لوہے کی ایک بھاری اور چمکدار زنجیر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ زنجیر عام زنجیروں جیسی نہیں تھی۔ اس کی ہر کڑی پر باریک، پیچیدہ اور ناقابلِ فہم نقش و نگار کندہ تھے، جو روشنی کے کسی زاویے سے جھلکتے تو یوں لگتا جیسے ان میں زہر آلود سنہری سانپ رینگ رہے ہوں۔

نعمان منظور

سلیمان شاہ گھنٹوں اس زنجیر کو تکتا رہتا۔ اس کا لمس اس کے لیے دہکتے ہوئے کوئلے جیسا بھی تھا اور سرد برف جیسا بھی۔ لیکن سب سے عجیب بات وہ آوازیں تھیں جو اس حویلی کی فضا میں رات کے پچھلے پہر گونجتی تھیں۔

”چھن... چھن...“

دھات سے دھات کے ٹکرانے کی یہ ہلکی، بوجھل اور دل دہلا دینے والی آوازیں تب شروع ہوتیں جب پورا شہر سو جاتا تھا۔ جب ہوا بھی اپنا سانس روک لیتی اور درختوں کے پتے ہلنا بند کر دیتے، تب اس کے کمرے سے لوہے کا سنگین سوگ گونجتا۔

ایک بارش سے تر رات، جب بجلی کی کڑک حویلی کی پرانی چھتوں جیسی چھت کو لرزا رہی تھی، سلیمان کے پاس ایک شخص آیا۔ وہ دانیال تھا — شہر کا ایک نوجوان صحافی اور سلیمان کے پرانے دوست کا بیٹا۔ دانیال عرصے سے اس پراسرار حویلی اور سلیمان شاہ کے بارے میں کہانیاں سنتا آ رہا تھا اور آج اس کا تجسس اسے ہر خطرے سے بے نیاز کر کے اس تاریک آستانے پر لے آیا تھا۔

سلیمان شاہ نے دانیال کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں کوئی تعجب نہیں تھا۔ اس نے کسی لفظ کے بغیر دانیال کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دانیال کو ایک خاص قسم کی حبس اور پرانی کتابوں، زنگ اور نم آلود مٹی کی ملی جلی بو کا احساس ہوا اور پھر اس کی نظر اس زنجیر پر پڑی۔

زنجیر فرش پر یوں بل کھائے پڑی تھی جیسے کوئی خطرناک اژدہا آرام کر رہا ہو۔

”یہ..... یہ کیا ہے، سلیمان چچا؟“ دانیال نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا، اس کی آواز میں غیر اختیاری طور پر لرزش تھی۔

سلیمان شاہ اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا، اس کے ہاتھوں کی کانپتی انگلیاں کرسی کے لکڑی کے بازوؤں پر جم گئیں۔ اس نے اپنی دھندلی آنکھیں اٹھائیں اور دانیال کو غور سے دیکھا۔

”یہ آزادی کی قیمت ہے، دانیال... یا شاید غلامی کی ابدی سند۔“ سلیمان شاہ کی آواز میں ایسی سنگینی تھی جیسے کوئی گہرے کنویں کے اندر سے بول رہا ہو۔

”مجھے سمجھ نہیں آئی۔“ دانیال نے آگے بڑھتے ہوئے زنجیر کو چھونا چاہا، لیکن سلیمان شاہ کا ہاتھ یکا یک چیل کی طرح جھپٹا اور اس نے دانیال کی کلائی کو سختی سے پکڑ لیا۔

”غلطی سے بھی اسے مت چھونا!“ سلیمان شاہ نے غرا کر کہا، اس کے چہرے کی جھریاں خوف اور غصے کے امتزاج سے بھیانک ہو گئیں۔ ”یہ وہ زنجیر نہیں ہے جو

جسموں کو باندھتی ہے۔ یہ ارواح کا طوق ہے۔ یہ انسان کے اپنے بنائے ہوئے گناہوں، اس کی حسرتوں اور اس کے خوف کی تانی بانی سے بنی گئی ہے۔''

دانیال نے ڈر کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''آپ کھوئے ہوئے سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ محض لوہے کا ایک ٹکڑا ہے، زنگ آلود اور قدیم!''

سلیمان شاہ تلخی سے مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک المیہ چھپا تھا۔ ''تم نئے دور کے لوگ ہو، تم صرف وہی دیکھتے ہو جو سمیٹ سکو۔ تم نے کبھی ان ان دیکھی زنجیروں کا وزن محسوس نہیں کیا جو تمہاری روح کے گرد لپٹی ہوئی ہیں؟ نفرت کی زنجیر، حرص کی زنجیر، ماضی کی یادوں کی زنجیر؟ تم سمجھتے ہو کہ تم آزاد ہو؟ تم صرف ایک بڑے پنجرے میں سانس لے رہے ہو جس کی سلاخیں نظر نہیں آتیں۔''

دانیال نے حیرت سے سلیمان شاہ کو دیکھا۔ ''اگر یہ زنجیر اتنی ہی بھیانک ہے، تو آپ اسے اپنے کمرے کے وسط میں رکھ کر اس کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ آپ اسے پھینک کیوں نہیں دیتے؟''

''پھینک دوں؟'' سلیمان کی آنکھوں میں ایک ویران ہنسی ابھری۔ ''یہ مجھ سے جڑی ہے، دانیال۔ یہ میں نے خود ڈھالی ہے۔ ہر بار جب میں نے کسی سے جھوٹ بولا، جب میں نے کسی کی حق تلفی کی، جب میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو دبایا...... اس زنجیر میں ایک نیا چھلا، ایک نئی کڑی جڑ گئی۔ میں اسے پھینک نہیں سکتا کیونکہ اگر میں نے اسے توڑنے کی کوشش کی، تو میری اپنی سانسیں ٹوٹ جائیں گی۔''

دانیال کو لگا کہ بوڑھا سلیمان اب مکمل طور پر اپنے حواس کھو چکا ہے۔ لیکن اسی لمحے، حویلی کے دروازے زور سے کھڑکھڑائے۔ ہوا کا ایک شدید جھونکا کھڑکی کے بوسیدہ پٹوں کو پھاڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور کمرے میں جلتی ہوئی واحد موم بتی بجھ گئی۔

پورے کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ دانیال نے گھبرا کر اپنے فون کی ٹارچ جلانی چاہی، لیکن فون کی اسکرین بالکل سیاہ رہی جیسے اس کی بیٹری یکایک ختم ہو چکی ہو۔ اندھیرے میں صرف دو انسانوں کے سانسوں کی آوازیں تھیں...... اور پھر وہ آواز شروع ہوئی۔

''چھن...... چھن......''

دھات کے آپس میں رگڑ کھانے کی سنسنی خیز آواز!

دانیال کا دل حلق میں آ گیا۔ ''سلیمان چچا؟''

اس نے پکارا، لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

زنجیر کے سرسرانے کی آواز فرش پر بڑھنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لوہا خود بخود حرکت کر رہا ہو، جیسے اس میں زندگی دوڑ گئی ہو۔

چھن چھن کی آواز اب سلیمان کی کرسی کے قریب سے آ رہی تھی، لیکن ساتھ ہی ایک اور گہری، بھیانک اور غار جیسی سانسوں کی آواز بھی گھل مل گئی۔

ایک سیکنڈ کے لیے آسمان پر بجلی کڑکی اور حویلی کے کمرے میں چند لمحوں کے لیے روشنی کا ایک ننگا کوڑا برسا۔

اس ایک لمحے کی روشنی میں دانیال نے جو دیکھا، اس نے اس کے وجود کا خون منجمد کر دیا۔

زنجیر اب فرش پر نہیں تھی۔ وہ ہوا میں تیر رہی تھی اور اس کا ایک سرا سلیمان شاہ کے سینے کے اندر دھنسا ہوا تھا! وہ لوہا اس کے گوشت اور پوست میں یوں پیوست تھا جیسے وہ اس کے وجود کا ہی ایک حصہ ہو۔ اور زنجیر کا دوسرا سرا کمرے کے تاریک کونے میں پھیلی ہوئی ایک خوفناک، سائے نما شبیہ کے ہاتھ میں تھا — ایک ایسا سایا جس کی کوئی واضح شکل نہیں تھی، مگر اس کی دو جلتی ہوئی زرد آنکھیں دانیال کو گھور رہی تھیں۔

سلیمان شاہ کا چہرے پر کوئی تکلیف کا تاثر نہیں تھا، بلکہ ایک عجیب، بھیانک سکون تھا۔ اس نے دانیال کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا:

''اب وقت آ گیا ہے، دانیال۔ میری زنجیر کی آخری کڑی مکمل ہو چکی ہے۔''

دانیال خوف سے چیخا اور پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے جا ٹکرا۔ ''یہ... یہ کیا ناٹک ہے؟ کون ہے وہ؟''

''یہ میں ہی ہوں'' سلیمان شاہ کی آواز اب دوہری ہو چکی تھی، جیسے اس کے اندر سے کوئی اور بھی بول رہا ہو۔ ''یہ میرا وہ ماضی ہے جسے میں نے عمر بھر چھپایا۔ یہ وہ سچ ہے جو میں نے عجائب گھر سے چرایا تھا، یہ وہ گناہ ہے جس نے میرے پورے خاندان کو نگل لیا۔ اور اب، یہ زنجیر مجھے اپنے ساتھ کھینچ رہی ہے۔''

روشنی پھر چلی گئی۔ اندھیرے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا، جیسے لوہے کا ایک بھاری تختہ فرش پر گرتا ہے۔ پھر سلیمان شاہ کی ایک دردناک چیخ گونجی، جو آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی... اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

دانیال کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا، لیکن اس کا پاؤں کسی وزنی شے سے اٹکا اور وہ منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ فرش پر پھیلی ہوئی کسی ٹھنڈی اور دھاتی

شے سے ٹکرائے۔
وہ زنجیر تھی۔
دانیال نے ہمت جمع کی، اپنی جیب سے ماچس نکالی اور کانپتے ہاتھوں سے ایک تیلی جلائی۔
موم بتی کی مدھم زرد روشنی میں، کمرہ بالکل خالی تھا۔ سلیمان شاہ اپنی آرام دہ کرسی پر نہیں تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف وہ کرسی خالی پڑی تھی اور فرش پر وہ بھاری زنجیر موجود تھی۔
دانیال نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور سانس بحال کرنے کی کوشش کی۔ ”یہ صرف میرا وہم تھا...... کوئی نظر کا دھوکا......“ اس نے خود کو تسلی دینی چاہی۔
لیکن جب اس نے ماچس کی تیلی کو زنجیر کے قریب کیا تاکہ اسے غور سے دیکھے، تو اس کا سانس سینے میں اٹک گیا۔
زنجیر کے آخری سرے پر، جو پہلے بالکل سادہ اور خالی تھا، اب ایک نیا چھلا جڑا ہوا تھا۔ اور اس نئے چھلے پر، بالکل تازہ اور واضح الفاظ میں، دانیال کا اپنا نام کندہ تھا!
اس کے ساتھ ہی، اس کی جیب میں رکھا ہوا فون خود بخود روشن ہو گیا اور اس کی اسکرین پر ایک پیغام چمکا:
”زنجیر کبھی ختم نہیں ہوتی...... یہ صرف ہاتھ بدلتی ہے۔“
دانیال نے خوفزدہ ہو کر زنجیر کو پیچھے دھکیلنا چاہا، لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے اپنے دائیں ہاتھ کی کلائی پر ایک ٹھنڈا، زنگ آلود اور بوجھل لمس قائم ہو چکا تھا۔ اس نے نیچے دیکھا...... زنجیر کی آخری کڑی اس کی اپنی کلائی کے گرد خود بخود لپٹ چکی تھی اور اس کا کلاپ بند ہو چکا تھا۔
اس نے پوری طاقت سے زنجیر کو کھینچا، لیکن وہ لوہا اب اس کی جلد کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کے اپنے جسم کے اندر سے، اس کی اپنی روح کی گہرائیوں سے ایک آواز ابھری — اس کے اپنے چھپائے ہوئے راز، اس کے بولے گئے جھوٹ، اس کا اپنا ماضی...... وہ سب اس لوہے میں ڈھل رہے تھے۔
حویلی کے باہر بارش تھم چکی تھی، لیکن حویلی کے اندر، اب ایک نئی کہانی کی ابتدا ہو چکی تھی۔
دانیال نے سلیمان شاہ کی خالی کرسی کی طرف دیکھا، پھر اپنی کلائی میں بندھی زنجیر کو دیکھا۔ اس نے تلخی سے مسکرا کر اپنے قدم اس کرسی کی طرف بڑھا دیے۔
اور رات کے پچھلے پہر، شہر کی اس پرانی گلی میں ایک بار پھر وہی آواز گونجنے لگی:
”چھن......چھن......“

☆☆☆☆☆

غزل

الگ جہاں سے تھے، لیکن جہاں کے ساتھ رہے
غبار ہو کے بھی ہم، کارواں کے ساتھ رہے

تمام رات گزاری، تھکن کے خیمے میں
تمام دن، جسدِ ناتواں کے ساتھ رہے

ہر ایک ظلم سہا، ہم نے بے زباں ہو کر
شریکِ کارِ ستم، جسم و جاں کے ساتھ رہے

سفر میں بھی، ہوس ہم سفر نہ سر سے گئی
سفر کناں، ہوسِ آشیاں کے ساتھ رہے

تمام عمر بس اک رت جگے میں بیت گئی
تمام عمر ہم اک مہرباں کے ساتھ رہے

خالد احمد

قفسِ رنگ و بُو میں رہتے ہیں
ہم تری آرزُو میں رہتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

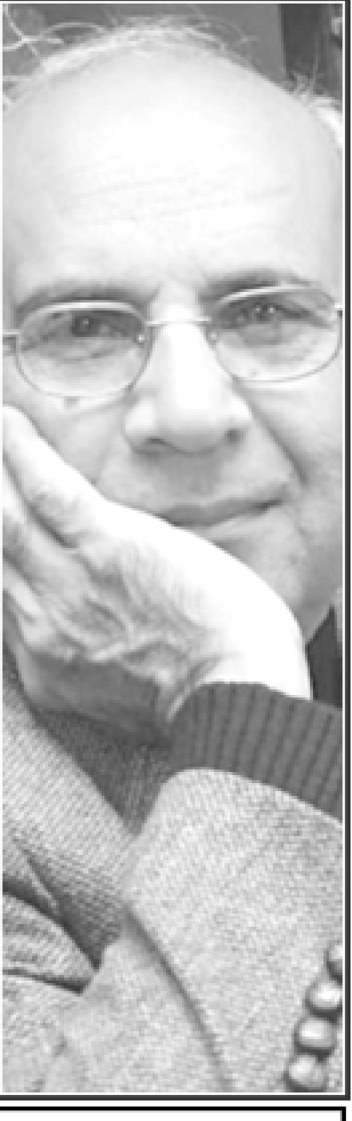

ہمارے شام و سحر کی ہے داستاں کچھ اور
کہ منفعت کا جو سوچیں تو ہو زیاں کچھ اور

شبیہ کیسے مکمل کرے کوئی اُس کی
یہاں کچھ اور دکھائے جھلک وہاں کچھ اور

کیا ہے غور کبھی اِس پہ بھی زمیں والو
ہوا ہے غیظ میں کب کب یہ آسماں کچھ اور

وہ اپنے طور پہ طے کر چکے ہیں سب، لیکن
اب آپ دیکھئے ہوتا ہے کب، کہاں کچھ اور

کہیں گے بات ہزار احتیاط سے، پھر بھی
تراش لے گا کہانی وہ بدگماں کچھ اور

مرے نواحِ سخن میں ذرا ٹھہر کے تو دیکھ
دکھائی دینے لگے گا تجھے جہاں کچھ اور

بسا وہ دل میں تو سب کچھ بدل گیا عالی
مکیں بدلنے سے کیسے نہ ہو مکاں کچھ اور

جلیل عالی

غزلیں

ایک شانہ جھکا ہے قرضوں سے
دوسرا بھی لدا ہے خدشوں سے

بوڑھی آنکھوں میں عمر بھر کا ملال
نئی آنکھیں جوان خوابوں سے

گلیوں گلیوں ہے خالی پن کا راج
گرم بازار اگلے سودوں سے

لڑکھڑاتے ہیں شہر میں پنجر
روح غائب ہوئی ہے جسموں سے

خود فریبی ملی ہے ورثے میں
کیا ہو امید آتی نسلوں سے

اپنے دریا کھنگالنے ہوں گے
اب نہ بہلیں گے لوگ نعروں سے

صبح ہو گی شب غلامی کی
پھول کھلنے لگیں گے کانٹوں سے

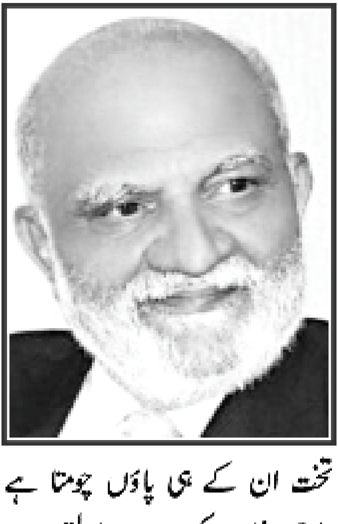

محمود شام

ہر کہانی پہ خاک ڈالتے ہیں
یوں ریاست کو ہم سنبھالتے ہیں

لٹکے رہتے ہیں وہ منڈیروں پر
عمر بھر وسوسے جو پالتے ہیں

ہم پگھلتے ہیں شمع کی صورت
گھپ اندھیرے کو بھی اجالتے ہیں

جانے کیوں کر رہے ہیں ترک وطن
وہ جو آئی ہوئی کو ٹالتے ہیں

تخت ان کے ہی پاؤں چومتا ہے
تاج شاہی کو جو اچھالتے ہیں

خوف کھاتے ہیں ہم تو قطرے سے
لوگ دریاؤں کو کھنگالتے ہیں

ہم مورخ ہیں یا فسانہ نویس
ہم جو صدیوں کو پل میں ڈھالتے ہیں

غزل
نذرِ تابش

سات پردوں میں زمانے سے چھپایا گیا میں
پھر ترے پیار کی آغوش میں لایا گیا میں

سنگ باری مری شاخوں پہ ثمر لاتی رہی
جانے کن ہاتھوں سے مٹی میں لگایا گیا میں

گردشِ وقت کسی چاک سے کم بھی تو نہیں
سنگ بنتا گیا مٹی سے بنایا گیا میں

ننگے پیروں سے بجھائے ہیں سلگتے انگار
آگ پر اتنا چلا جتنا چلایا گیا میں

جب بھی چاہو گے عبارت سے نکل آؤں گا
سطر در سطر ہوں لکھ لکھ کے مٹایا گیا میں

میرا قد ناپنے والوں کے قدم ڈول گئے
مسکراتا ہوا سولی پہ چڑھایا گیا میں

آنکھ بھر کر نہیں دیکھا مری جانب تو نے
تیرے در پر تو کئی بار خدایا گیا میں

اے محبت ترے ہونے کی خبر مل جائے
اتنا یاد آؤں اسے جتنا بھلایا گیا میں

دیکھ لیتے ہیں مجھے جب بھی کنور جی چاہے
سب کی نظروں میں ہوں منظر سے ہٹایا گیا میں

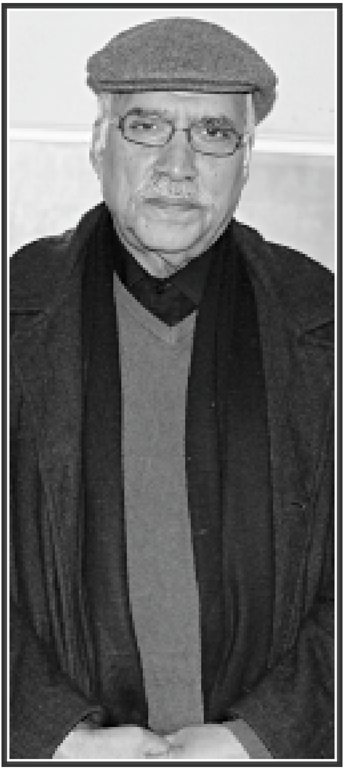

اعجاز کنور راجہ

غزل

اپنی آنکھوں سے نیا روز تماشا دیکھوں
دید وادید غنیمت ہے، یہ دنیا دیکھوں

آخر کار ہدف میرا بلندی دیکھے
گو نشیبوں میں بسوں، عرش معلیٰ دیکھوں

منتظر ہوں کہ سحر میری تجلی دیکھے
آخر کار ہر اک ڈوبتا تارا دیکھوں

بال و پرست نمائی میں نہ قدغن پائیں
دانہ و دام سے اعصاب کو بالا دیکھوں

بحر زخار مجھے راستہ دیتا جائے
عزم ایقان کو میں معرکہ آرا دیکھوں

غلط اندیش عناصر سے نمٹنے کے لیے
برق پاروں کو رگ و ریشہ میں اترا دیکھوں

وادیِ دل میں زیاں کار نہ منظر ابھرے
حسن فطرت کو بہر رنگ میں نکھرا دیکھوں

صدق آثار ملے رزق فراواں مجھ کو
ہاتھ بے سعی جو آئے، اسے ادنیٰ دیکھوں

حسن ظن کرتا رہے پشت پناہی میری
بدگمانی سے حذر دل کو مصفا دیکھوں

رہوں دنیا کے مناظر سے سبک دوش مدام
کبھی طیبہ ہو نظر میں، کبھی بطحا دیکھوں

مجھ کو بدوضع عناصر سے سروکار نہیں
ایک اک آنکھ میں آئینہ مصفا دیکھوں

ہو ریاض سخن ایسا جو بنے ناز سخن
فکر ہو ایسا رسا، دل کو میں اجلا دیکھوں

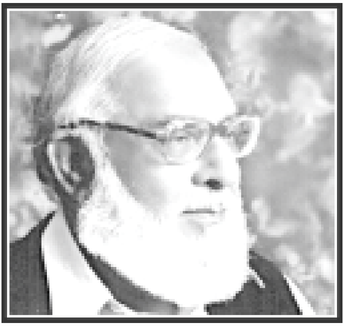

سید ریاض حسین زیدی

غزل

جیتنے آئے ہیں ، نہ ہارنے آئے ہیں
ہم ووٹر تو ، نعرے مارنے آئے ہیں

جنھوں نے باری باری ہم پر راج کیا
ہم تو اُن کے قرض اتارنے آئے ہیں

پہلے وہ اپنے حالات سنواریں گے
جو میرے حالات سنوارنے آئے ہیں

وہ بھی اپنا وقت گزارنے آئے ہیں
ہم بھی اپنا وقت گزارنے آئے ہیں

مُلکوں مُلکوں ، ہوئے جزیروں کے مالک
میرے عدو کو جو للکارنے آئے ہیں

یوں لگتا ہے ، ہمی غریبوں کے بچے
اپنی جان وطن پر وارنے آئے ہیں

جو شہروں کو ملیا میٹ کیے ہوئے ہیں
جہاں میں روپ امن دھارنے آئے ہیں

ملبے سے شہروں کی صورت گری تلک
ہم ہیں ، جو ہر نقش سنوارنے آئے ہیں

ہم نے تنہا جنگ لڑی ہے ، جانِ انیس!
کوئی کہے نہ ہمیں پکارنے آئے ہیں

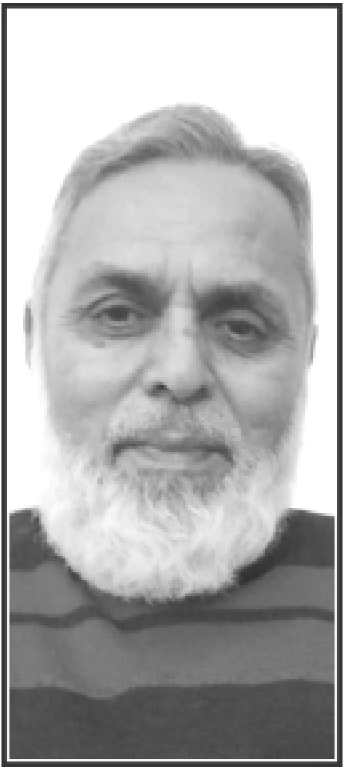

محمد انیس انصاری

غزلیں

ہم کہ ہوتے تھے کبھی جن کے نگہداروں میں
مارتے پھرتے ہیں اب سر اُنھی دیواروں میں

یوں تو رونق ہے بہت مصر کے بازاروں میں
کوئی جیتا بھی ہے یوسف کے خریداروں میں؟

آ دھمکتے ہیں کہانی میں جہاں موقع ملے
ایک عادت ہے عجب حاشیہ برداروں میں

داستانوں میں کہیں ذکر بھی آتا نہیں اب
ہم ہی ہوتے تھے کبھی مرکزی کرداروں میں

تھی وفاداری کبھی رسمِ محبت خاورؔ
اب تو اِس شے کی رمق تک بھی نہیں یاروں میں

خاور اعجاز

فقط وہ حسن ہی رہتا نہیں تگ و دو میں
ہے کوئی اور بھی شامل چراغ کی لو میں

کہاں کا دل میں اِرادہ کیے ہوئے تھے ہم
کہاں نکل گئے تیرے خیال کی رَو میں

کسی بخیل سے اُمیدِ فضل مت رکھیے
تلاش کیجے نہ گندم کا سا مزا جو میں

اُسی چراغ کی لو سے ہے مستعار کرن
جھلک دِکھاتی ہے جو آدمی کے پرتو میں

جہاں پہ زندگی کرتے رہے ہیں میر و اسد
پڑے ہیں ہم بھی تو خاورؔ اُسی قلمرو میں

غزل

خمار خانۂ دنیا و دیں کے ساتھ رہے
ہم آسمان کے باسی زمیں کے ساتھ رہے

کچھ ایسی نفرت گو نا تھی جاہ پرستوں سے
جہاں رہے کسی گوشہ نشیں کے ساتھ رہے

زمیں جو خاک اڑاتی رہے مکینوں پر
پھر ایسا کون ہے جو اس زمیں کے ساتھ رہے

یہ رقص گاہِ ستم پروراں کے باسی لوگ
ہر ایک ناگ نشیں آستیں کے ساتھ رہے

کلاہ جبر مناتی رہی کہ ہاں کہہ دیں
نہیں کہا تو پھر ہم اس نہیں کے ساتھ رہے

جو سجدہ ریز ہوئی مالکِ حقیقی کو
تمام عمر ہم ایسی جبیں کے ساتھ رہے

اوریا مقبول جان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج تھا، مگر، رات گئے ڈوب سکا تھا
اے صبحِ قیامت، میں نکل آؤں نہ گھر سے

غزل

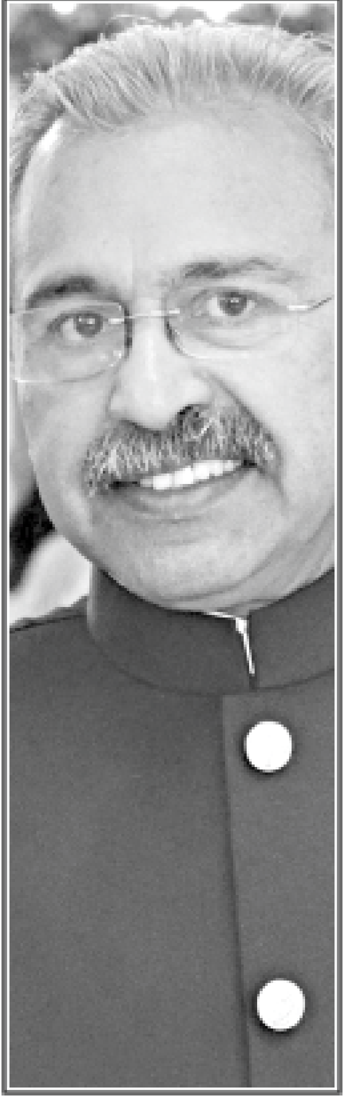

کچھ ہی برس میں جانے یہ کیا ہو گیا مجھے
پہچانتا نہیں ہے مرا آئینہ مجھے

افسوس یہ ہے کیوں نہ کیا اس کا ارتکاب
جس کی سزا ملی ہے بے جرم و خطا مجھے

اپنی بجائے میری طرف دیکھتا ہے کیوں
حیران ہو کے دیکھ رہا ہے خدا مجھے

موجود ڈور بھی ہے ہوا بھی ہے ساز گار
کٹ کر لگا ہوں ہاتھ تو کھل کر اڑا مجھے

چادر اگر بنا ہی لیا ہے تو سوچ مت
جب چاہے اوڑھ اور جہاں چاہے بچھا مجھے

پیوست ہونے والا ہوں خود اپنی روح میں
اے دوست اپنے آپ سے آ کر بچا مجھے

راحت خدا ہی جانے کہ کس کی ہے بددعا
لگتی نہیں ہے دیکھ لو دے کر دعا مجھے

راحت سرحدی

غزلیں

اندیشہ ہائے ہجر کے جالے اتار لوں
دریائے غم کے پار سفینے پار اتار لوں

پہنوں گا وصلِ نو کا دمکتا ہوا لباس
پہلے میں خستہ ہجر کے کپڑے اتار لوں

وہ پیڑ کہہ رہا ہے کہ تھوڑا سا انتظار
میں چاہتا ہوں شاخ سے کچے اتار لوں

جانے دوں تنہا چاند کو پانی کے درمیاں
اور چاندنی کو جھیل کنارے اتار لوں ؟

شہرِ وفا میں بام پہ لانے سے پیشتر
یارا میں تیرے حسن کے صدقے اتار لوں

ایسا نہ ہو کہ خواب کی گاڑی سے گر پڑے
میں زندگی کو کھینچ کے نیچے اتار لوں

شاہد لگی ہوئی ہے تعاقب میں زندگی
میں عاشقی کے بوجھ کو سر سے اتار لوں

افتخار شاہد

تم جو کہتی ہو تو کچھ اور سنور جاتے ہیں
رقص کرتے ہوئے راہوں میں بکھر جاتے ہیں

ناز کرتی ہیں سبھی باغ کی کلیاں ان پر
پھول جو آپ کے قدموں میں بکھر جاتے ہیں

لوگ کیا چیز ہیں اس شہر کے رستے سارے
جس طرف تیرا اشارا ہو ادھر جاتے ہیں

ایک آواز کا جادو جو ہمیں کھینچتا ہے
ایک صورت نظر آتی ہے جدھر جاتے ہیں

ہم تو بھٹکے ہوئے آتے ہیں تمہاری جانب
وہ جو بھٹکے ہی نہیں جانے کدھر جاتے ہیں

ہم کو منظر میں سمانا نہیں آیا شاہد
لوگ تو خواب کے پہلو میں اتر جاتے ہیں

غزل

ہمیں صلیب سے زندہ اتارنے والے
ہماری گھات میں ہیں پھر سے مارنے والے

ہمیں نکالنے والے وہی ہیں جنت سے
فلک پہ پھر ہمیں واپس پکارنے والے

ہمارے جیتنے کا ہم سے بڑھ کے دکھ ہے کسے
ہمارے سر پہ مسلط ہیں ہارنے والے

ہماری ذات میں کیا کیا تلاش کرتے ہیں
وہ آئے روز نیا روپ دھارنے والے

تمھارے ساتھ گزارا کریں تو کیسے کریں
جب اپنے ساتھ نہیں ہم گزارنے والے

یہ ہاتھ تجھ سے کوئی ہاتھ کیوں کریں گے بھلا
یہی تو ہیں تری زلفیں سنوارنے والے

کھلے کھلے سے وہ چہرے نظر نہیں آتے
گل و گلاب کے عارض نکھارنے والے

ہمارے تھر کو بھی دریا سے بار آور کر
سمندروں میں جزیرے ابھارنے والے

نکال سکتے ہیں ہم کو ہمارے خیمے سے
ہمارے خیمے میں پاؤں پسارنے والے

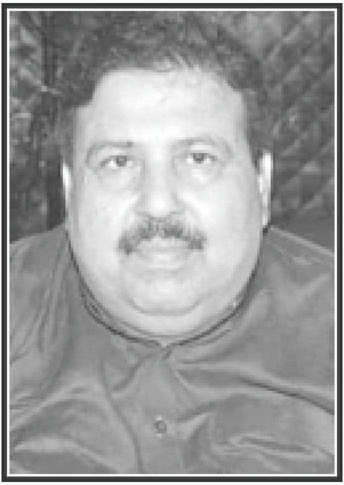

مسعود احمد

غزل

کیا شام ڈھلے ، وقتِ سحر ، سیکھ رہی ہیں
آنکھیں مری رونے کا ہنر سیکھ رہی ہیں

خوشبو سی لیے اوڑھنی ، رنگوں کے شفق پر
یہ تتلیاں آدابِ سفر سیکھ رہی ہیں

سودا تھا کبھی کلیوں کو بھی حسن زنی کا
عینِ عشق کے اب زیر زبر سیکھ رہی ہیں

بے سمت فضاؤں میں نئی نسلیں پریشاں
کیا سیکھ رہی ہیں یہ اگر سیکھ رہی ہیں

ماحول کے برزخ میں لرزتی ہوئی بچیاں
باہر سے شناسا ہیں نہ گھر سیکھ رہی ہیں

یہ شہر ہمارا ہے یا اک دشت رضا ہے
سوچیں بھی یہاں دہشت و ڈر سیکھ رہی ہیں

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

غزل

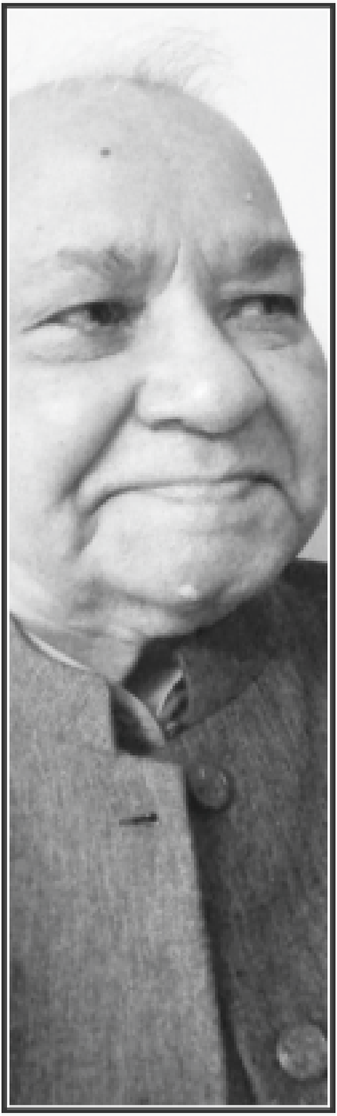

اجمل اعجاز

وہ جو رستے میں کھو گیا بادل
تیری آنکھوں کا ہو گیا کاجل

چاند نے دیکھ لی جھلک تیری
ڈھونڈتا پھر رہا تجھے پاگل

تیری آنکھوں میں ہے قیام مرا
اپنی پلکوں کا ڈال دے آنچل

راستے میں ملیں وہ پنگھٹ کے
گھر نہیں پہنچتی ، بھری چھاگل

چوڑیاں تیری دُھن بجاتی رہیں
گیت گاتی رہے تری پائل

ہجر کا دکھ ہے میرے چہرے پر
میں نہ مجذوب ہوں نہ میں پاگل

گیت بن کے نہ پہنچی کانوں تک
شور کرتی رہی تری پائل

غزل

جب عمر بھر نہ شوق سے سجدہ ہوا ادا
دل راہِ مستقیم سے بھٹکا ہوا لگا

اک اہتمامِ خاص سے مقتل سجا دیے
کیا کیا ہوا نہ شہر میں کیا کیا ہوا کیا

اب اہلِ حسن ڈھونڈتے ہیں گو بہ گو مجھے
حیراں ، یوں بزمِ ناز کو کرتا ہوا چلا

رستے یہ کہہ رہے ہیں کہ منزل اسی کی ہے
منزل کی سمت کوئی جو بڑھتا ہوا گیا

دنیا پہ آشکارا ہو کیوں داستانِ عشق
ہونا تھا ایک تجربہ ، جیسا ہوا ہوا

رعبِ جمالِ یار کوئی معجز نمائیاں
رک ہی گیا زبان پہ آیا ہوا گلہ

پہچان اپنے آپ کی ، پا تا نہیں ہوں میں
ایسا ہوں اپنے آپ کو بھولا ہوا بھلا!

روتا ہوا اسے کبھی تنہائیوں میں دیکھ
محفل میں ہر کسی سے جو ہنستا ہوا ملا

شوکت کسی کی یاد ہے دل میں بسی ہوئی
کافی ہے تیرگی میں یہ جلتا ہوا دیا

شوکت محمود شوکت

غزلیں

قبیلے کے ستم میں ڈھل رہے ہیں
وہ جلتے کوئلوں پر چل رہے ہیں

ہماری پیاس کی ہے آزمائش
ترے نینوں کے بھیتر جل رہے ہیں

کھلی ہے رات کی رانی کی خوشبو
اور اس میں سانپ بھی کچھ چل رہے ہیں

بناتے ہیں گھروندے ریت کے جو
سمندر کی غصیلی چھل رہے ہیں

بہت ہی نرم لہجوں سے لگا ہے
کچھ انگارے سے اندر پل رہے ہیں

بکھرتی چشمِ حیراں کو چھپاتے
یونہی اپنی وہ آنکھیں مل رہے ہیں

ادھوری نیند کی سیڑھی سے گر کر
سنبھلتے خواب بھی بوجھل رہے ہیں

ہمیں تو چاہیے اک پورا پنگھٹ
ہمارے دل دہکتے تھل رہے ہیں

تنویر قاضی

کسی بارش کے جو بادل رہے ہیں
تمہاری آنکھ کا کاجل رہے ہیں

نہیں مانجھی سے اب نظریں ملاتے
مسافت کے لیے بےکل رہے ہیں

رکھو جاری تم اپنی گفتگو کو
لگے جیسے کہ جادو ٹل رہے ہیں

زمانے بن گئے ہیں شامیانے
تمہارے ساتھ اک دو پل رہے ہیں

کھڑی ہے ہونٹوں پر اخروٹ مل کر
کبوتر چھتریوں پہ جل رہے ہیں

در آئے جو دھنک میں رنگ ہو کر
ترے جوبن کا وہ آنچل رہے ہیں

تمہارے نین دشتِ تشنگی میں
تھکے کاندھوں کی اک چھاگل رہے ہیں

کوئی بھیتر اذیت ہے انہیں بھی
خود اپنی خواجگی میں گھل رہے ہیں

غزل

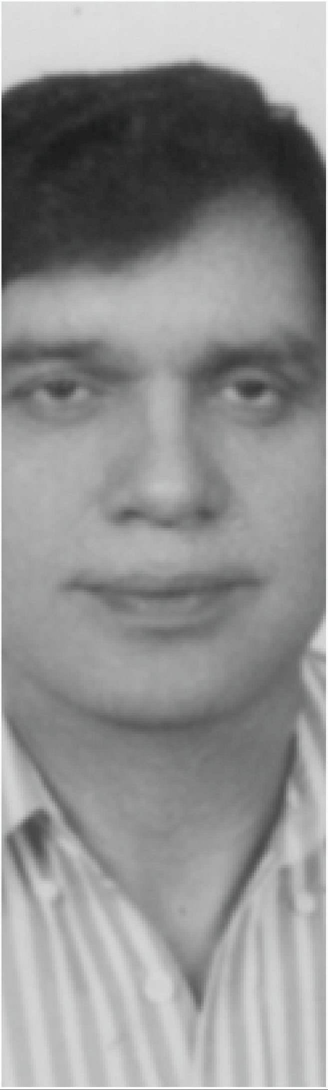

اجڑتے جاتے پرانے مکان، شام بخیر
اے میرے جسم، اور اے میری جان، شام بخیر

پلٹ کے آیا تو گھر کا کنواں بھی سوکھا ہُوا
کہیں پہ خوشۂ گندم ، نہ دھان ، شام بخیر

نڈھال ہوتے سُروں کا ہُوا گداز تمام
ٹھٹھرتی جاتی ہے ہر ایک تان ، شام بخیر

تُو صبحِ نَو کے جہانوں سے ہو کے آئی ہے
غروبِ مہر سی میری اڑان ، شام بخیر

لپٹ کے خود سے بہت دیر تک میں سو جاؤں
اداس شام سی میری تھکان ، شام بخیر

ہر ایک دفترِ تقسیم و ضرب ، لاحاصل
یقین کیسا ، کہاں کا گمان ، شام بخیر

نہیں ہے عمر کے ترکش میں تیر سانسوں کا
ہے ٹوٹنے کو بدن کی کمان ، شام بخیر

قیوم طاہر

غزل

اے جانِ صد بہار یہ میرا نصیب ہے
تُو پھول دے کہ خار یہ میرا نصیب ہے

تُو درد زخم، رنج والم جو بھی بخش دے
ہوں محوِ انتظار یہ میرا نصیب ہے

گلشن میں مثلِ گُل مجھے کِھلنے تو دیجیے
پھر سیج یا مزار یہ میرا نصیب ہے

میں جنگ لڑ رہا ہوں کسی اور کے لیے
اب جیت ہو کہ ہار یہ میرا نصیب ہے

نکلا ہوں گھر سے تیری تمنا لیے ہوئے
گلشن کہ ریگزار یہ میرا نصیب ہے

اقبال زندگی کی نظر سے نظر ملا
پھر آر ہو کہ پار یہ میرا نصیب ہے

اقبال سروبہ

غزل

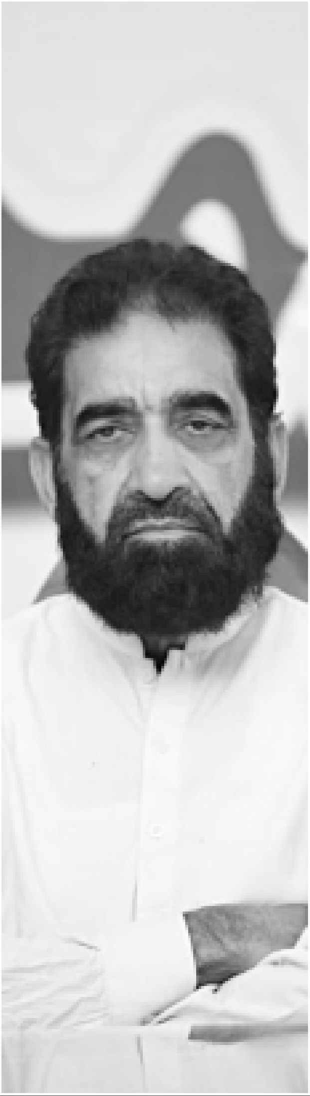

ایسے بچھا دیا ہے شکاری نے دام کو
کوئی پرندہ بچ نہیں پائے گا نام کو

لاہور میں بھی مانگتے ہیں اب دعائیں لوگ
بچہ جو گھر سے نکلا ہے لوٹ آئے شام کو

اس عہد ناسپاس میں ہر نوجوان نے
بالائے طاق رکھ دیا ہر احترام کو

سرکار کو ملا جو تحفظ تو اس نے پھر
لوٹا ہے دونوں ہاتھوں سے مرتے عوام کو

خوش فہمیاں تو دیکھیے گردن اکڑ گئی
گردن جھکائی اس نے ذرا جو سلام کو

مینا و جام ہم کو میسر تھے پر اے سعد
نسبت نہ ہم سے تھی کوئی مینا و جام کو

سعداللہ شاہ

غزل

ایک عرصہ چھپائی گئی ہر بات ہماری
پھر کھولی بھرے شہر میں اوقات ہماری

ہمراہ کیا لمس بدن ساتھ میں اس نے
خوشبو میں بسی بھیجی ہے سوغات ہماری

سورج بھی چلا آیا تھا دینے کو سلامی
تاروں کو لیے نکلی تھی بارات ہماری

بارش نہ کہو، ابر کرم ٹوٹ کے برسا
ہم سے نہ سمیٹی گئی برسات ہماری

ملتا ہے ہر اک روز اجالے کا تعطل
ڈھل جاتی ہے اک رات میں ہر رات ہماری

اک عمر چلے ساتھ، بھلے کیسے چلے ہم
اب ڈھونڈ رہا ہے وہ شروعات ہماری

ابرو کا اشارہ وہ سمجھ لیتا ہے لیکن
یہ شعر سنا پاتے نہیں بات ہماری

اے چرخ کہن دینا ذرا اپنی گواہی
مٹی میں ملا دی گئی ہے ذات ہماری

اب سب سے الگ بیٹھے ہوئے سوچ رہا ہوں
یہ عمر گریزاں ہی تو تھی مات ہماری

غافر شہزاد

غزل

ترا میرا وہ تعلق جو کہ جسم کا ہے جاں سے
بھلا کس طرح نکالوں تجھے اپنی داستاں سے

جو سراب میں نے دیکھا جو عذاب مجھ پہ اُترا
ہے دعا کہ تو نہ گزرے کبھی ایسے امتحاں سے

لٹا جب سے آشیانہ نہ ملا کوئی ٹھکانا
مجھے پستیو سنبھالو میں گرا ہوں آسماں سے

وہی زخمِ دل ہے ہمدم وہی ہیں اداس موسم
وہی شامِ غم کے سائے وہی دردِ بیکراں سے

ترے در کا میں گدا ہوں ترے در پہ آ گیا ہوں
مجھے در بدر نہ کرنا نہ اٹھانا آستاں سے

احمد جلیل

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

مجھ سے طلوعِ صبح کے منظر چھپا گئی
ٹھنڈی ہوا چلی تو مجھے نیند آ گئی

غزل

دل نے اسے دیکھا ہے کسی اور طرح بھی
یہ واقفِ دُنیا ہے کسی اور طرح بھی

بیکار بھی جا سکتی ہے برسوں کی ریاضت
یہ عشق تو کُھلتا ہے کسی اور طرح بھی

شاید وہ سمجھ پائے نہ احوال دل و جاں
اک خط اُسے لکھنا ہے کسی اور طرح بھی

یوں بھی تو گنہگار سمجھتا ہوں میں خود کو
یہ واقعہ سمجھا ہے کسی اور طرح بھی

میں صحبتِ مہتاب میں بیٹھا تو یہ جانا
دل جلتا ہے، بجھتا ہے، کسی اور طرح بھی

تقدیر، مقدر کے علاوہ بھی تو کچھ ہے
اس بارے میں سوچا ہے کسی اور طرح بھی

غائز بسا اوقات تو دھک دھک کے علاوہ
دل اپنا دھڑکتا ہے کسی اور طرح بھی

کاشف حسین غائز

غزل

آنکھوں سے جب منظر گم ہو جاتے ہیں
جیتے جاگتے پیکر گم ہو جاتے ہیں

ان کے ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ رکھو
بھیڑ میں بچے اکثر گم ہو جاتے ہیں

جن کے دم سے روشن تھے شب کے آنگن
وہ سارے ہی پیکر گم ہو جاتے ہیں

وقت کی دھول میں اکثر ہم نے دیکھا ہے
برسوں پرانے پتھر گم ہو جاتے ہیں

ڈھونڈتے ہو تم دنیا کے اس میلے میں
ہم تو ذات کے اندر گم ہو جاتے ہیں

جا لگتے ہیں جو گمنام جزیروں میں
ان کے مرکز محور گم ہو جاتے ہیں

منزل اپنی دھیان میں رکھنا ورنہ اب
رستوں میں کچھ بے گھر گم ہو جاتے ہیں

روشنیوں کی اس رنگین نمائش میں
جسم کے سارے زیور گم ہو جاتے ہیں

کس اندھیاری رات کی سازش ہے آصف
روشن روشن سے گھر گم ہو جاتے ہیں

شفیق آصف

غزل

پردۂ شب کو سرسراتی ہے
اُس کی خوشبو ہوا جو لاتی ہے

ریل کی اک صدائے بے ہنگم
اُس کے قصّے مجھے سناتی ہے

زرد پھولوں کی بیل کیوں میری
شاخِ جاں سے لپٹتی جاتی ہے

میری آنکھوں کے آئینے میں، تری
ذات تصویر بنتی جاتی ہے

جب بھی آتی ہے تیری یاد مجھے
توڑ کر جسم و جاں رُلاتی ہے

روز اُمید باندھتی ہوں میں
روز اُمید ٹوٹ جاتی ہے

تیری بخشی ہوئی یہ تنہائی
میری جاں میں اُترتی جاتی ہے

کبھی بیتے دنوں کی یاد تری
جانے کیوں مجھ کو گدگداتی ہے

تیری خوشبو ہے ہر طرف افروز
شاخِ گُل سے صدا یہ آتی ہے

افروز رضوی

غزل

غیر ممکن کو ممکنات کریں
ہم مکمل یہ کائنات کریں

جاں کے صحرا میں روشنی بھر دیں
دل کی وادی میں چاند رات کریں

درد کو ہی دوا بنائیں ہم
یہ سلوک اپنے دل کے سات کریں

اس کو اُجالیں اس قدر ہم لوگ
روشن الفت سے شش جہات کریں

ابنِ آدم ہے ساری جب خلقت
ختم باہم یہ ذات پات کریں

دل کے صحرا میں پھول کھلتے ہیں
پیار سے آپ جب بھی بات کریں

فرحت عباس

غزل

زندگی ہے موت کے آثار کے چاروں طرف
دُور تک خلقِ خدا ہے دار کے چاروں طرف

لا الہٰ کے صرف لا تک ہی ابھی پہنچا تھا میں
روشنی پھیلی مرے انکار کے چاروں طرف

سوچتا ہُوں ایک ایسا زاویہ سورج کے ساتھ
سایۂ دیوار ہو دیوار کے چاروں طرف

نام تیرا میں غزل میں گر لکھوں، جانِ غزل!
حاشیے لگ جائیں گے اشعار کے چاروں طرف

تُو نے کیا اعجاز بخشا ہے غمِ تنہائی کو
بھیڑ رہتی ہے ترے بیمار کے چاروں طرف

خواب وہ ہوتا ہے جس میں نیند آئے اور نہ چین
جیسے تُو ہے دیدۂ بیدار کے چاروں طرف

شہر کے حاکم کو کیا خیرات کی سُوجھی سلیم
ایک مجمع آ لگا نادار کے چاروں طرف

تتلیاں دن بھر طوافِ کاکلِ جاناں کریں
شب میں جگنو جاگتے ہیں یار کے چاروں طرف

محمد سلیم ساگر

غزلیں

اوصاف شیخ

میں چپ ہوں تو برابر چیختا ہے
نہ جانے کون اندر چیختا ہے

یہ دل ہے اس پہ اتنی برہمی کیوں
یہ بے چارہ تو اکثر چیختا ہے

مرے اندر کوئی سہما پڑا ہے
مرے اطراف اک ڈر چیختا ہے

چمن میں خوف کا پہرہ لگا ہے
ہوا خاموش منظر چیختا ہے

تو در آیا ہے میرے دائرے میں
لے تو بھی دیکھ پتھر چیختا ہے

سسکتا ہے کوئی تکیے کے نیچے
میں سو جاؤں تو بستر چیختا ہے

اسی نے تو مجھے آوارگی دی
گلی میں بھی یہ شب بھر چیختا ہے

یہ سناٹا ہے یا ہے خوف کوئی
یہ کیا اوصاف گھر گھر چیختا ہے

ہم نے سر پر سوار وحشت کی
اور بے اختیار وحشت کی

ہم نے سو بار تجھ سے عشق کیا
ہم نے ہر بار یار وحشت کی

اس نے دریا میں ڈالا کچا گھڑا
ہم نے دریا کے پار وحشت کی

ہم نے صحرا اٹھایا کاندھوں پہ
اور جنوں میں شکار وحشت کی

ہم نے صحراؤں کو سکھایا رقص
خود پہ اوڑھا غبار ، وحشت کی

اور پھر اس گلی میں آ نکلا
اور پھر تار تار وحشت کی

ہم نے اک شب گزاری گھر اوصاف
یعنی اک شب ادھار وحشت کی

غزل

ترے بعد کوئی بھی معتبر نہیں ہو سکا
مرا دردِ دل کبھی مختصر نہیں ہو سکا

یہ جو کارِ عشق تھا نقصِ ذات بنا رہا
بڑی دیر تک تو کیا مگر نہیں ہو سکا

لبِ شاہراہ گمان سے ذرا دور تھا
میں اسی سبب کبھی رہگذر نہیں ہو سکا

میں خیابِ حُسن میں اپنی جاں سے گزر گیا
مگر اس کے دل پہ ذرا اثر نہیں ہو سکا

وہ جو آبیار نہ ہو سکا کسی فصل میں
وہ زمینِ دل پہ کبھی شجر نہیں ہو سکا

میں جو راہِ عشق سے ہو کے آیا تھا مُشک بُو
مرا اس مقام سے پھر گزر نہیں ہو سکا

نہ سمجھ سکے گا وہ عابدی کے کلام کو
جو شعور حرف سے باخبر نہیں ہو سکا

علی حسین عابدی

غزل

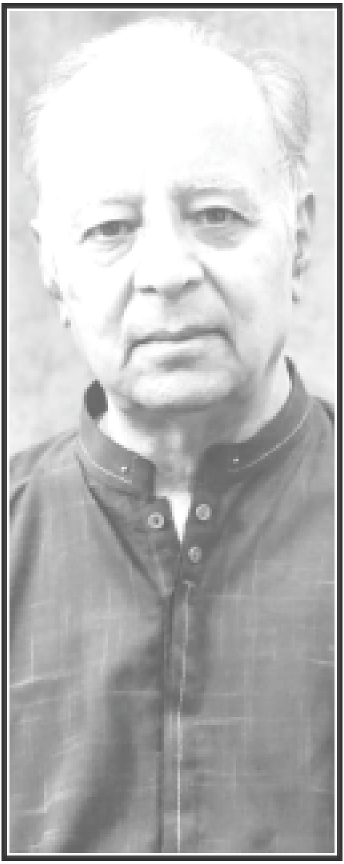

ہو سکے تو اپنی آنکھوں سے یہ پانی روک لو
دوستوں کی شہر سے نقلِ مکانی روک لو

موت بن جائے گا تم پر یہ بڑھاپا ایک دن
جس طرح ممکن ہو یہ اپنی جوانی روک لو

لکھنے والوں سے یہ کہہ دو یہ ڈگر اچھی نہیں
جو مکمل دار پر ہو وہ کہانی روک لو

بھسم کر ڈالے گی چہرے گھر جلا ڈالے گی یہ
اگ نہ پائے ذہن میں تم بدگمانی روک لو

بے وفائی شہر کی معصومیت نہ کھا سکے
اس وفا کے شہر کی یادیں پرانی روک لو

جب چلا جائے گا عرفی ڈھونڈنا ہو گا محال
روک لو اسکو بڑی ہے مہربانی روک لو

سمیع اللہ عرفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل دھڑکنے پہ بھی آمادہ نہ پایا خالد
ہر نفس گوش بر آواز خدا اپنا تھا

غزل

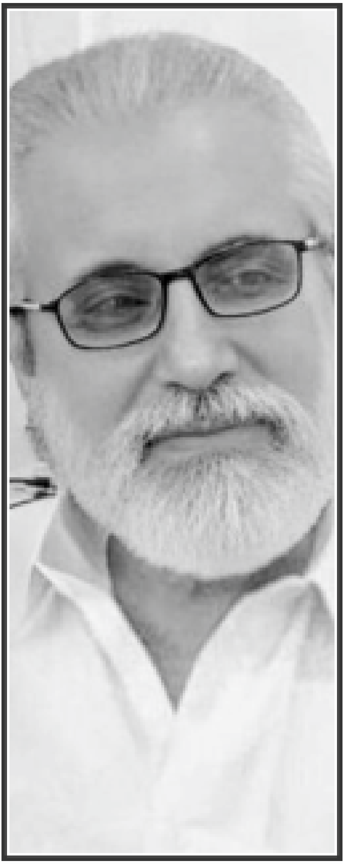

میں نے کشتی بنائی کاغذ پر
موج لہرا کے آئی کاغذ پر

دل کی دنیا بسائی کاغذ پر
بات دل کی جو، لائی کاغذ پر

تیری صورت بنائی کاغذ پر
ایک رونق سی چھائی کاغذ پر

رقص کرنے لگے حروف سبھی
بزم ایسی سجائی کاغذ پر

راز کس نے جلا دیا افضل
آگ کس نے لگائی کاغذ پر

افضل ہزاروی

ہمارا آسماں خالی نہیں ہے
ہمارے تن پہ ہیں کچھ سرخ تل بھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

پیار کرنا تو بھول ہوتا ہے
دل ہے، پھر بھی، ملول ہوتا ہے

آنکھیں ہوں بند لب رہیں خاموش
معرفت کا حصول ہوتا ہے

غار سے روشنی نکلتی ہے
آیتوں کا نزول ہوتا ہے

ہوتا ہے معجزہ بھی ہوتا ہے
ماورائے عقول ہوتا ہے

اچھے لگتے ہو غصے میں، ویسے
اتنا غصہ فضول ہوتا ہے

وقت، لاوقت، لمحے، بے معنی
وقت یادوں کی دھول ہوتا ہے

آنکھوں سے شعلگی برستی ہے
اور ہاتھوں میں پھول ہوتا ہے

دوست کہتے ہو میرے دشمن کو؟
دوستی کا اصول ہوتا ہے

عشق کی راہ میں کانٹے
آبلے، سب قبول ہوتا ہے

شبہ طراز

غزل

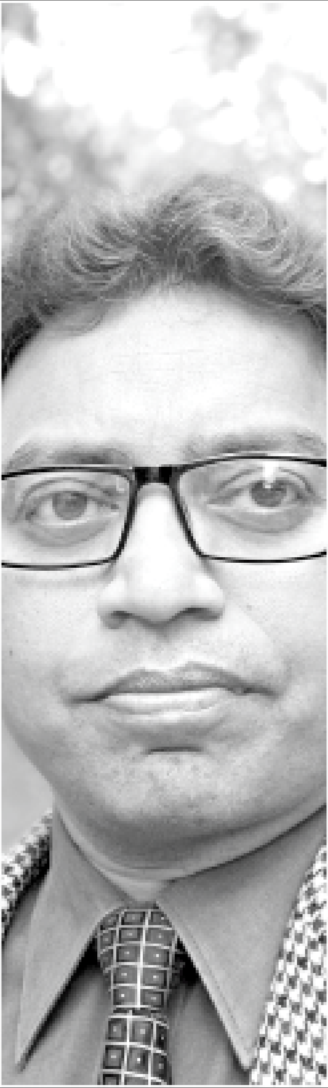

ہم نے سو بار بھلانے کی قسم کھائی تھی
پھر بھی اک شخص سے صدیوں کی شناسائی تھی

لوگ کہتے رہے حالات بدل جاتے ہیں
میری قسمت میں مگر ایک ہی تنہائی تھی

تم نے پوچھا ہی نہیں، میں نے بتایا بھی نہیں
کیسے کہتا کہ مری جان تُو ہرجائی تھی

رات خاموش تھی، کمرے میں کوئی تنہا تھا
پھر تری یاد دبے پاؤں چلی آئی تھی

ہم نے ہر زخم کو ہنس ہنس کے چھپایا برسوں
رازِ دل کھلتا اگر، درد کی رسوائی تھی

ہم نے مانا کہ محبت بھی خسارہ ہے مگر
اس خسارے میں بھی اک عمر کی دانائی تھی

آج دشمن ہے تو کل دوست بھی ہو سکتا ہے
مجھ کو یہ بات بھی دشمن نے ہی سمجھائی تھی

اُس نے جبرانؔ کہا، بھول بھی جاؤ مجھ کو
ایک لمحے میں مری جان پہ بن آئی تھی

وسیم جبران

غزل

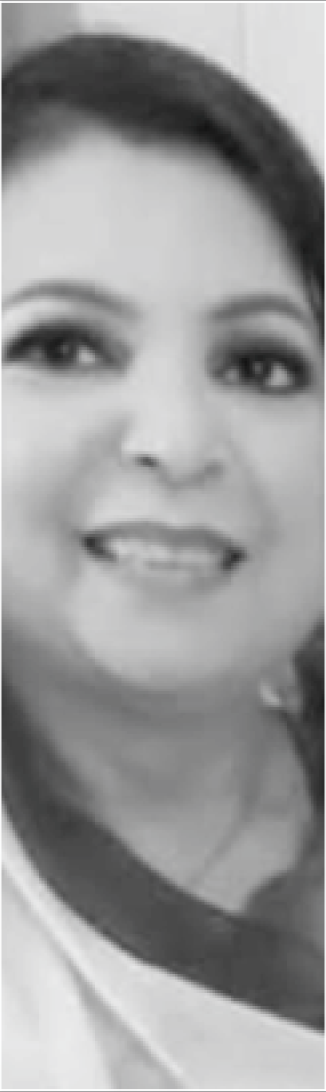

خالدہ انور

درد کے باب میں زندگی کاٹ دی
اک ترے خواب میں زندگی کاٹ دی

عشق بھٹکا پھرا شہرِ بھنور میں
اور پنجاب میں زندگی کاٹ دی

جو وفا کے صحیفے میں تھا ہی نہیں
اک اُسی باب میں زندگی کاٹ دی

پاؤ بھر رونقیں ڈھیر تنہائی کا
اِن ہی اسباب میں زندگی کاٹ دی

جو نہیں تھے ہمارے مزاج آشنا
ایسے احباب میں زندگی کاٹ دی

لب پہ شکوہ نہیں ، آنکھ بھی نم نہیں
غم کے آداب میں زندگی کاٹ دی

بابِ عشق و مروت نہ ہم پہ کُھلا
گو اِسی باب میں زندگی کاٹ دی

غزل

زمین اوڑھی ، کبھی آسماں غلاف کیا
سکون خود میں ملا ، خود میں اعتکاف کیا

نہیں سے ہو کے گزرتا ہے راستہ ہاں کا
سو لا الہ کہا ، ختم اختلاف کیا

یقیں میں کھولے تھے احرام دشت والوں نے
یقیں میں خیمہ توحید کا طواف کیا

بس ایک خواب کی دوری پہ ہے درِ مقصود
ہر ایک حرف نے وہیں جا کے اعتراف کیا

چمک اُٹھا ہے الف لام میم سے مرا دل
ذرا سی گرد ہٹائی ، ذرا سا صاف کیا

منافقین سے اب بھی ہے دشمنی اعجاز
مسافرانِ رہ عشق کو معاف کیا

عاصم اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چھوڑتے ہی نہیں زندانِ تعلق خالد
کچھ اسیروں کو اگر چھوڑ دیا جاتا ہے

غزل

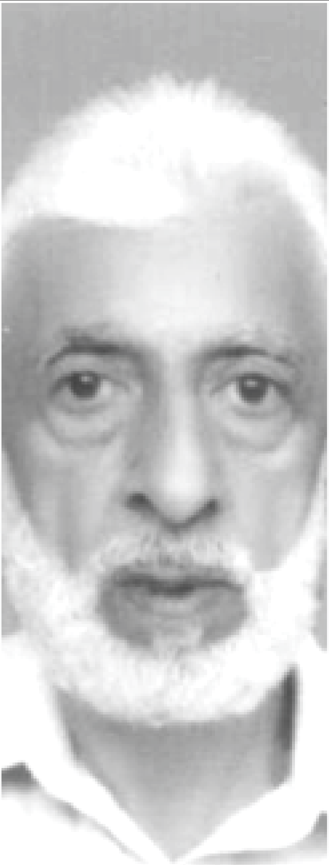

ہوا کے سنگ مل کے ناچتے ہیں
خزاں میں خوب پتے ناچتے ہیں

جب اُس کی یاد کی آندھی چلے تو
سبھی کمرے کے پردے ناچتے ہیں

برس پڑتی ہے جب بھی کھل کے بارش
خوشی سے گھر کے بچے ناچتے ہیں

پلٹ آیا ہے شاید قیس پھر سے
جو صحرا میں بگولے ناچتے ہیں

نااہلی ہے ہمارے حاکموں کی
جو شہروں میں اندھیرے ناچتے ہیں

قریب آتے ہی مادھو لعل میلہ
قلندر غوث اکٹھے ناچتے ہیں

نچاتے ہیں کبھی دنیا کو شاہد
کبھی خود ہی اکیلے ناچتے ہیں

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

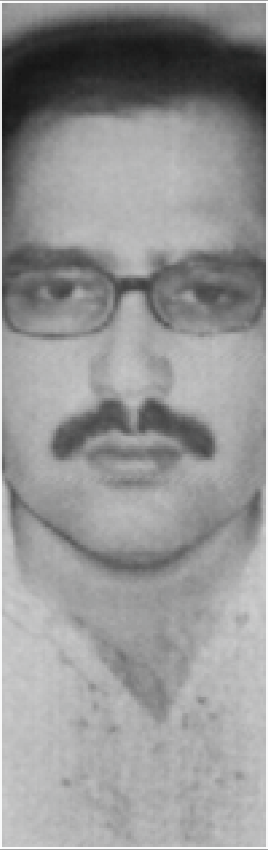

کہیں روپ سروپ کا جادو ہے کہیں خوشبو ہے انجانی سی
مرے جنگل آوازوں سے بھرے مرے شہروں میں ویرانی سی

کل شب کو خواب میں دیکھی تو میں صبح تلک حیران رہا
اک نامانوس سی شکل مگر کچھ کچھ جانی پہچانی سی

کوئی اڑتی تتلی اس بن کی وہ یاد ہمارے بچپن کی
اب ذہن کے اک گوشے میں یونہی بھر جاتی ہے ویرانی سی

جب خون میں لت پت اخباریں دہلیز پہ سر ٹکراتی ہوں
دل پر طاری ہو جاتی ہے اک کیفیت ہیجانی سی

وہ منظر ترے جانے کا وہ موسم دل گھبرانے کا
مرے ہونٹوں پر خاموشی تھی اور آنکھیں پانی پانی سی

حسن جمیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روز تجھ کو قریہ قریہ ڈھونڈنے جاتا ہوں مَیں
روز اِک دشتِ محبت چھان کر آتا ہوں مَیں

غزلیں

زندہ دلی کے جتنے تھے آثار مر گئے
یعنی کہ مجھ میں ہی مرے افکار مر گئے

اِک خواب نے تو آنکھ کے مقتل میں جان دی
باقی جو بچ رہے، سرِ بازار مر گئے

دل میں ہی دب گئے مرے گریے کے شور سے
کچھ اشک آنکھ جھیل کے اُس پار مر گئے

دل سے نکل رہی ہے مرے، رفتگاں کی یاد
جو لوگ یاد آئے وہ ہر بار مر گئے

دُنیا ترے حصول کی رغبت نہیں رہی
بس یوں سمجھ لے تیرے طلب گار مر گئے

شیریں سخن کا لہجہ ہوا اور اتنا تلخ و ترش
ہم دیکھ کر ہی گرمیِ گفتار مر گئے

اشرف گزاری دُنیا میں بے کار زندگی
جیسے جیے تھے ویسے ہی بے کار مر گئے

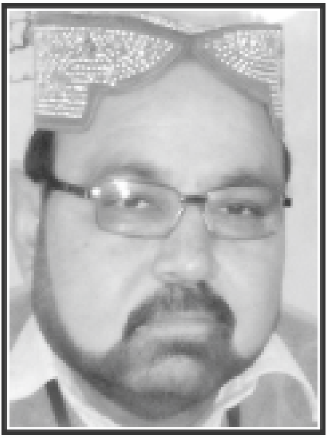

اشرف نقوی

اے یارِ غم گسار ترا آئینہ ہوں میں
کر میرا اعتبار ترا آئینہ ہوں میں

دل میں مری طرف سے کدورت نہ کوئی رکھ
کر صاف ہر غبار، ترا آئینہ ہوں میں

خوابوں کی بستیوں میں مرے ساتھ ساتھ چل
اے یار طرح دار ترا آئینہ ہوں میں

دکھلائی دے گی مجھ میں تجھے اپنی ہی جھلک
کر مجھ سے آنکھیں چار، ترا آئینہ ہوں میں

چلتا رہے جو ساتھ مرے بن کے ہم سفر
جھیلوں گا دُکھ ہزار، ترا آئینہ ہوں میں

یہ حُسنِ دل فریب جو تُو عکس میں ڈھلے
تجھ کو میں دوں نکھار، ترا آئینہ ہوں میں

اشرف نہ اپنے آپ کو مجھ سے سمجھ الگ
بس یہ سمجھ لے یار! ترا آئینہ ہوں میں

غزل

عالم ہے بازگشت سے یارب بھرا ہوا
جاؤں کہاں سکوت سے امشب بھرا ہوا

جی چاہتا ہے فرش و فلک پر انڈیل دوں
اوہام سے ہے ساغرِ مشرب بھرا ہوا

خوشیوں سے دل میں ایک سماں تھا، نہیں رہا
بچوں سے خالی ہو گیا مکتب بھرا ہوا

لبریز ہونے لگتا ہوں اک اور لہر سے
اک لہر سے میں رہتا نہیں جب بھرا ہوا

معمورۂ خیال کی خانہ پُری نہ پوچھ
رہتا ہے بے خیالی سے قالب بھرا ہوا

پڑھتا ہوں لاکلامی کے بین السطور کو
کیا کیا ہے خالی پن میں بھی مطلب بھرا ہوا

حیرت کا دَوری جدوَل ابھی ناتمام ہے
امکان سے ہے بابِ مرکّب بھرا ہوا

میں اس سے خالی ہوتا ہوں پل میں ہزار بار
جس شعلے سے ہے سینۂ کوکب بھرا ہوا

دونوں جہان میرے چھلکنے سے بہہ گئے
میں تھا کسی کے غم سے لبالب بھرا ہوا

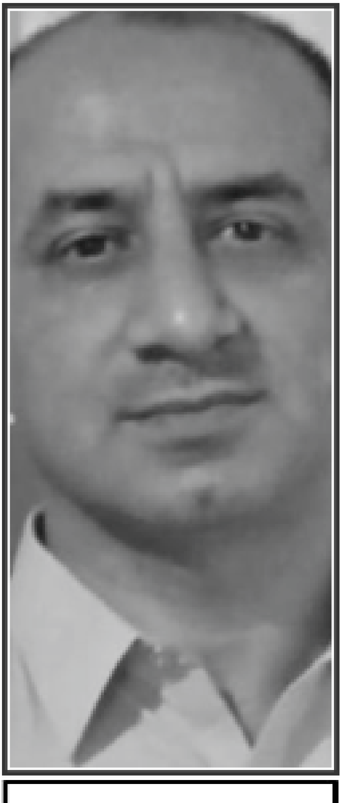

شاہد ماکلی

غزل

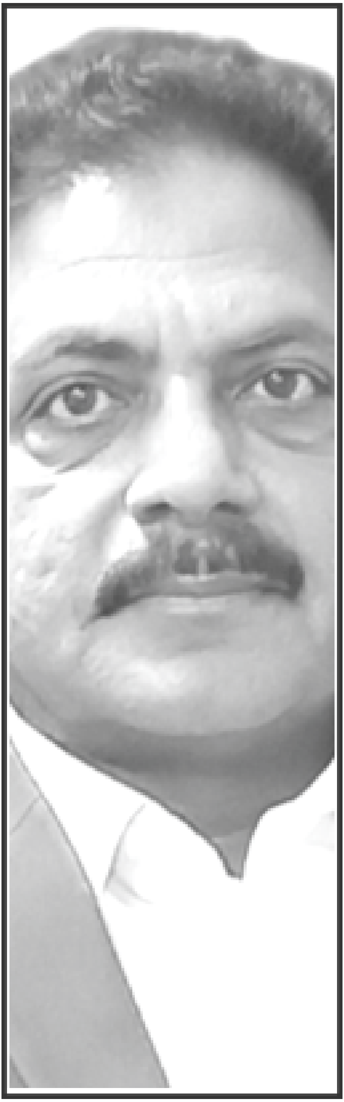

اس محبت سے بڑے کام لیے جاتے ہیں
مست ہاتھی بھی ہوں تو تھام لیے جاتے ہیں

ذکر جس کا نہ کسی طور گوارا تھا ہمیں
اس کا اب نام صبح و شام لیے جاتے ہیں

جو زمیں پر بھی ہمیں بوجھ سمجھتے تھے کبھی
آج ہم کو وہ سرِ بام لیے جاتے ہیں

ہم ہیں لٹنے کو بھی تیار حوالے سے ترے
نام تیرے سے بڑے کام لیے جاتے ہیں

وہ جو دو گام بھی چلنے پہ رضامند نہ تھا
ہم اسی شخص کو کالام لیے جاتے ہیں

اب محبت کے بھی کاموں میں ہے رشوت شامل
تم سے ملنے کے بھی کچھ دام لیے جاتے ہیں

ہم پہ دلشاد ہے چھایا ہوا سایا تیرا
بات بے بات ترا نام لیے جاتے ہیں

دلشاد احمد

غزل

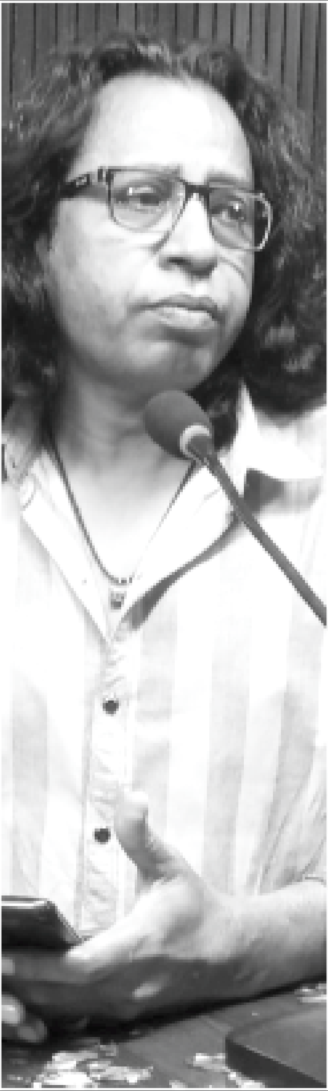

شبیر نازش

رنگ کچھ اَور دِکھائے گی گرانی یعنی
اُس کو بھاتی ہے فقط اشک فشانی یعنی

اُس کی باتوں سے جھلکتا ہے غمِ آئندہ
اَور الجھے گی حقیقت میں کہانی یعنی

یعنی اب تک جو ہُوا ہے وہ ہَوائی ہے سب
اُس نے لکھ پڑھ بھی سبھی کی ہے زبانی یعنی

واقعہ اَور سے اب اَور ہُوا جائے گا
اَور نکلیں گے بہت اس کے معانی یعنی

لوگ روتے ہیں مگر اشک نہیں گرتے ہیں
اُن کی آنکھوں میں ہے سُوکھا ہُوا پانی یعنی

بعد از مرگ بھی تحقیق کریں گے شاید
اور یہ خاک بھی اب جائے گی چھانی یعنی

ہم نے دیکھا ہے جوانی میں بڑھاپا نازش!
ہم نے دیکھی ہی نہیں اپنی جوانی یعنی

غزل

اصغر علی بلوچ

خواب آنکھوں میں سرِ عام لیے پھرتے ہیں
دل میں اک حسرتِ ناکام لیے پھرتے ہیں

خون رونے سے جو فرصت ہو تو سن چشمِ فلک!
ہم بھی تیرے لیے اک کام لیے پھرتے ہیں

اک عجب سیلِ تمنا ہے الٰہی! توبہ
لوگ پہلو میں بھی کہرام لیے پھرتے ہیں

ہاتھ میں پھرتے ہیں وہ خنجر و شمشیر لیے
اور ہونٹوں پہ وہ دشنام لیے پھرتے ہیں

کوئی تعزیر نہ پُرسش نہ شکایت صاحب
آپ اک بندۂ بے دام لیے پھرتے ہیں

اپنے ناکردہ گناہوں سے بھی ڈرتا ہوں علی
یار خود ساختہ الزام لیے پھرتے ہیں

غزل

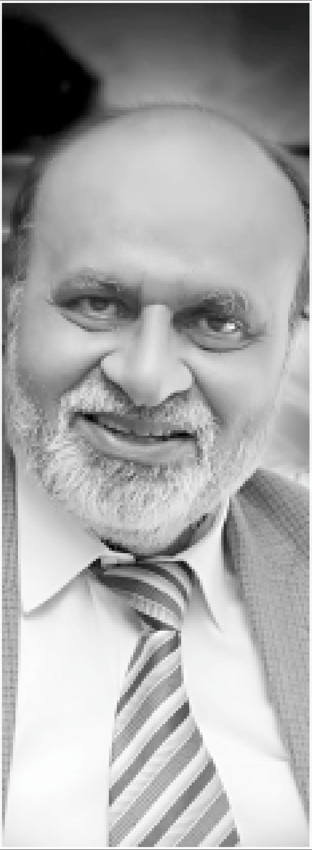

ہمیں تم سے محبت ہو گئی ہے
تبھی سے دل کو راحت ہو گئی ہے

ہمیں تم نے جو دیکھا اک ادا سے
لگا جیسے عنایت ہو گئی ہے

جو مانگا تھا وہی ہم کو ملا ہے
خدا کی ہم پہ رحمت ہو گئی ہے

وفا کا عہد کر کے بھول جانا
پرانی اس کی عادت ہو گئی ہے

بھلایا تھا جسے ہم نے کبھی کا
اسی کی اب ضرورت ہو گئی ہے

ذرا سی بات تھی لیکن جہاں میں
بپا اب اک قیامت ہو گئی ہے

احمد مسعود قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سادہ کاغذ بانٹا کیسے
یوں بھی کی ہے عرضِ ہنر

غزل

کس لیے ہیں راستے منزل اگر کوئی نہیں
جس طرح ہم ہو رہے ہیں در بدر کوئی نہیں

زر کے پتھر نے کچل دیں ان کے دل کی زمیاں
دے محبت بھی صدا، ان کو اثر کوئی نہیں

توڑ کر خوابوں سے ناطہ کون جی پایا یہاں
ایک صحرا زندگی، جس میں شجر کوئی نہیں

ایک جیسا خوابِ ہستی، ایک جیسی مشکلیں
کون مومن کون کافر، یہ خبر کوئی نہیں

چوس کر مزدور کا خوں کیسے ہو گھر میں سکوں
لاکھ چاہے کر دعائیں پر اثر کوئی نہیں

اس کلامِ روشنی کی خیر ہو روشن میاں
گھٹ گیا ہے ظرف بھی، اہلِ نظر کوئی نہیں

اعجاز روشن

غزل

کروں کیا گفتگو اس بے لحاظ و کج ادا سے
بڑھا دے گا مرے غم کو وہ اظہار انا سے

ضرورت کی تو ہر شے ہے میسر اس زمیں پر
نہ جانے کھینچ کر لائے گا انساں کیا خلا سے

کہاں سے تو چرا لائی ہے خوشبو آشنا سی
یہی بس پوچھنا ہے اب مجھے باد صبا سے

یہ کیسی کشمکش ہے اپنے اپنوں سے جدا ہیں
مرے مجھ سے بہت برہم، ترے تجھ سے خفا سے

یزیدِ وقت کے آگے کبھی جھکنا نہیں ہے
سبق ہم نے یہ سیکھا ہے شہیدِ کربلا سے

جو کشتی کو ڈبونے کے لیے مختص ہوا ہو
بھلا کیسے ملاؤں ہاتھ میں اُس نا خدا سے

جو میرا دکھ ہے باقی دوستوں کا بھی وہی ہے
ہیں سارے کاروانِ زندگی میں بے نوا سے

مری آمد پہ تم اس درجہ کیوں گھبرا گئے ہو
بھلا یوں بھی جھجکتا ہے کوئی آواز پا سے

کرو محنت خلوصِ دل سے جاں اپنی لڑا دو
کہ سارے کام تو ہوتے نہیں ہیں بس دعا سے

بہت محتاط ہو کر چل رہے ہو تم مرے ساتھ
اثر کیوں لے لیا تم نے زمانے کی ہوا سے

تمہیں فرحاں کوئی حل مل گیا کیا بے بسی کا
گلی میں بانٹتے پھرتے ہو لوگوں میں بتاسے

سرور فرحان

غزل

میں نے قسمت کو آزمایا تھا
وہ مری زندگی میں آیا تھا

وہ تصور تھا یا کوئی تصویر
تیرے آنے کا دھوکا کھایا تھا

میں نے اپنا سمجھ لیا تجھ کو
تو جو اپنا نہیں پرایا تھا

وقت ساکت ، مقام بھی ساکت
حسن نے معجزہ دکھایا تھا

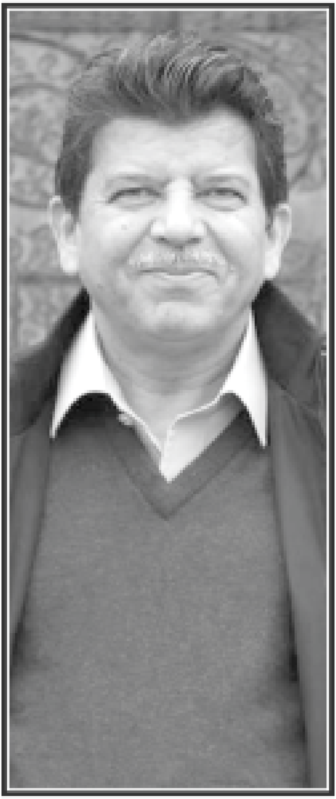

اس کے دل میں تھا کوئی پہلے سے
جس کسی سے بھی دل لگایا تھا

ساتھ تیرے رہا جو برسوں سے
میں نہیں تھا وہ میرا سایا تھا

خواب میں اک خیال تھا شاید
اس نے جیسے گلے لگایا تھا

میرے آنگن میں پھول کھلتے گئے
وہ جو بھولے سے مسکرایا تھا

جس نے ہر لمحہ میرا ساتھ دیا
میں کہاں تھا وہ میرا سایا تھا

راجہ عبدالقیوم

غزل

دل رہینِ قیاس تھا ہی نہیں
میں کبھی وقفِ یاس تھا ہی نہیں

کیا بتاؤں جوازِ ہجرت کا
مجھ کو وہ شہر راس تھا ہی نہیں

رائیگاں عمر کٹ گئی تو کھُلا
میں زمانہ شناس تھا ہی نہیں

کیا عجب دن تھے جب تری دھن میں
دل کو خوف و ہراس تھا ہی نہیں

کتنی شدت سے کل وہ یاد آیا
جب کوئی آس پاس تھا ہی نہیں

کیسے اٹھتی نظر زمانے کی
اپنا ایسا لباس تھا ہی نہیں

جیسے رہنے لگا ہے بعد اس کے
یوں کبھی دل اداس تھا ہی نہیں

علی رضا

غزل

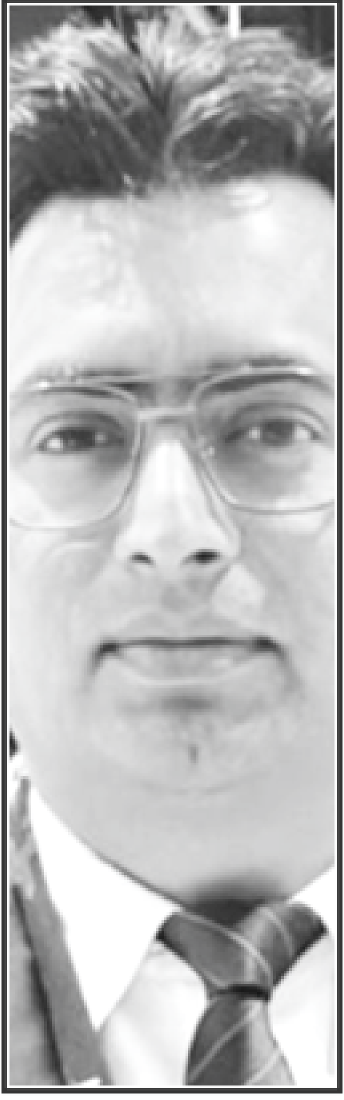

نسبت بڑھا گئی ہے مسافر کے ضبط کو
ریزہ کرے سلام ابو ذر کے ضبط کو

معلوم ہے مکان کے اندر نہیں کوئی
دستک سے دیکھنا ہے فقط در کے ضبط کو

جتنی بھی ہے لطیف تہی دامنی ابھی
آخر کو توڑ دے گی گداگر کے ضبط کو

تدبیر مجھ کو سوجھ گئی بن میں جا رہوں
میں آزما رہا تھا مدبر کے ضبط کو

میں رو پڑا ، اسی کا پرستار ہو گیا
جیسے ہی جانا مجھ سے متاثر کے ضبط کو

وادی میں جا کے خون کے چھینٹے بھی صاف کر
کافی نہ ہو گی داد ہی کاشر کے ضبط کو

ساگر ، شباب دشت کی برداشت مرحبا
تحسین و آفرین ، معمر کے ضبط کو

ساگر حضور پوری

غزل

اک تھکن سے نکلنا چاہتی ہے
روح تن سے نکلنا چاہتی ہے

مسئلہ جان کو بدن سے نہیں
وہ تھکن سے نکلنا چاہتی ہے

کب تلک قید میں رہے خوش بو
جو چمن سے نکلنا چاہتی ہے

مر کے بھی مضطرب ہے خاک مری
اب کفن سے نکلنا چاہتی ہے

راہ مسدود میں رکی ہوئی فکر
کوئے فن سے نکلنا چاہتی ہے

بات پہلے زبان سے نکلی
پھر وطن سے نکلنا چاہتی ہے

عقل تحقیق پہ ہوئی مائل
حسنِ ظن سے نکلنا چاہتی ہے

وہ محبت جو پہلے اندھی تھی
اندھے پن سے نکلنا چاہتی ہے

فاختہ گھر چکی ہے لاشوں میں
سو وہ رن سے نکلنا چاہتی ہے

آ گئی تھی کہیں سے اک خواہش
آج من سے نکلنا چاہتی ہے

یاد مجنوں کی گرد باد میں ہے
اور بن سے نکلنا چاہتی ہے

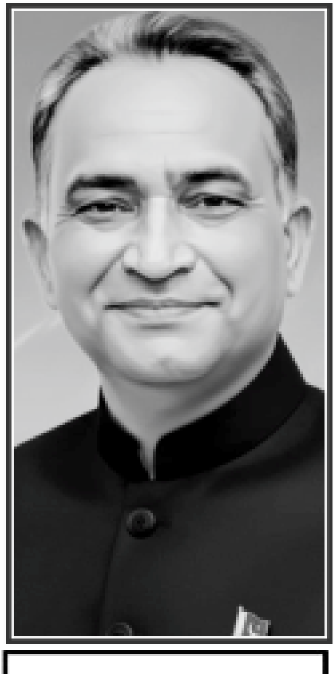

علمدار حسین

غزل

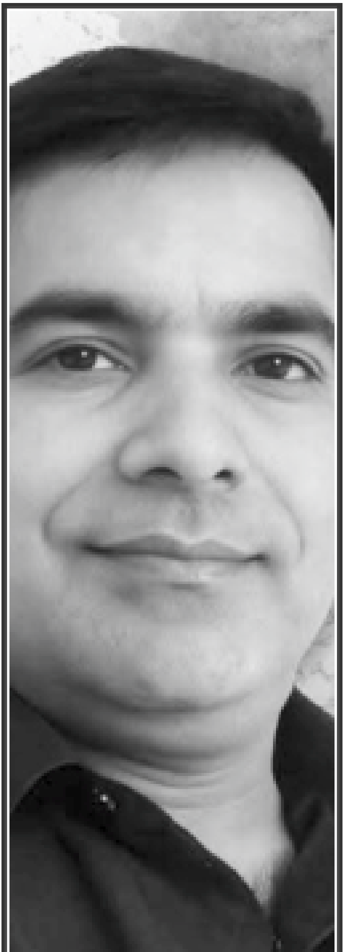

اکرم جاذب

یونہی قربان تو خوشیاں نہیں کرتا ہوں میں
جتنا ممکن ہو دل آزاری سے ڈرتا ہوں میں

نیتِ نیک کو ہی نیکی سمجھ لیتا ہوں
اور خمیازہ بھی اس فعل کا بھرتا ہوں میں

ایسے ناخوش مجھے رکھتا ہے بلندی کا سفر
جیسے پاتال میں ہر لحظہ اترتا ہوں میں

آ گیا ایسے مجھے جوڑنا ریزے اپنے
بے دھڑک حسبِ رضا اب تو بکھرتا ہوں میں

ڈر لگا رہتا ہے مانوس سے رستوں پہ مجھے
اجنبی راہ سے بے خوف گزرتا ہوں میں

اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کے ارمانوں کا
زندہ رہنے کے لیے روز ہی مرتا ہوں میں

غم پسندی نے مجھے بخشے ہیں ایسے بھی جواز
کہ اگر اشک بہاتا ہوں نکھرتا ہوں میں

اپنی ہر راہ میں خود ہوتا ہوں حائل جاذب
اور الزام بھی اپنے پہ ہی دھرتا ہوں میں

غزل

امر مہکی

ڈھابے پہ بنا وہ دوست مرا، میتوں کا وہ میتا ہے
باتیں بہت میٹھی کرتا ہے، پھیکی چائے پیتا ہے

تھوڑا سا بہل جاتا ہے دل، اُس سے مل کر شام ڈھلے
بخیہ گری کا ہنر ہے اُس میں، چاک گریباں سیتا ہے

شعر و سخن کے علاوہ کسی میں، کم ہی رہی ہے دلچسپی
چائے کڑک سی اپنی سہیلی، سگریٹ اپنا چہیتا ہے

تنہائی میں مجھ سے پوچھا ہے، خنک ہوا کے جھونکے نے
برسات میں کس کا ساتھ رہا، ساون کیسا بیتا ہے

دشت کے منظر سے لگتا ہے، لمحہ قیمتی ہے کتنا
آگے چوکڑی بھرتی ہرنی، پیچھے بھاگتا چیتا ہے

داؤ پہ خود کو لگا کر اُس نے، چال عجیب چلی ہے امر
آخری پتا جوکر نکلا، ہاری بازی جیتا ہے

غزل

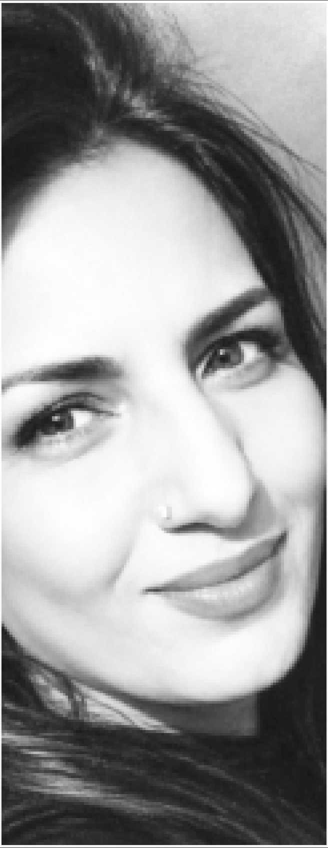

تجھے جب سے میں نے دیکھا مجھے تیری جستجو ہے
کبھی دل تھا صرف میرا مگر آج اِس میں تو ہے

مجھے بھول جانے والے ترا شکریہ کہ تُو نے
مرا غم رکھا سلامت ترا دکھ جو کو بہ کو ہے

تجھے سوچتی ہوں اتنا تری سوچ بھی نہیں ہے
مری خامشی سے بس اب، تو ہی محوِ گفتگو ہے

تجھے من کے کلیاں چٹکیں تجھے من کے دل یہ مہکے
ترے جیسا اِس نگر میں کہاں کوئی خوش گلو ہے

مری ناتمام غزلیں یہ ادھوری آدھی نظمیں
ترے غم کا میرے دل میں یہی جا بجا رفو ہے

الماس شبی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نہ تجھے غموں کی قُلقُل، نہ تِہِ کاسۂ زرِ گُل
مرے درد کے رفیقو! زرِ غم لٹائے رکھنا

غزل

ہوا کرتے ہیں حق والے ہی شرمسار دنیا میں
جو رہزن ہیں وہی ہیں صاحبِ دستار دنیا میں

وہ جنکے کاندھے پہ اپنا نہیں ہے سر جہاں والوں
بنائے جاتے ہیں اکثر وہی سردار دنیا میں

یہاں ظلم و ستم والے کا ہر سو بول بالا ہے
جنھیں سردار ہونا تھا ملی ہے وار دنیا میں

وہی باتیں کیا کرتے ہیں اُلفت کی اصولوں کی
اگاتے ہیں دلوں کی کھیت میں جو خار دنیا میں

جو جھٹلاتے تھے نبیوں کو ہیں زندہ اُن کی اولادیں
بتاؤ کیا کریں ہم اُن سے ہیں بیزار دنیا میں

خدا رکھے سلامت اُن بزرگوں کو ضیاء شاہد
جنھوں نے زندہ رکھا ہے حسیں کردار دنیا میں

جو غاصب ہیں جو کھا لیتے ہیں حق سارا غریبوں کا
وہ ایسا کر کے بن بیٹھے ہیں جاگیردار دنیا میں

انھیں معلوم ہے پونجی سلامت رہ نہیں سکتی
لٹیرے کو بناتے ہیں جو پہرے دار دنیا میں

صوفی محمد ضیا شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

غزل

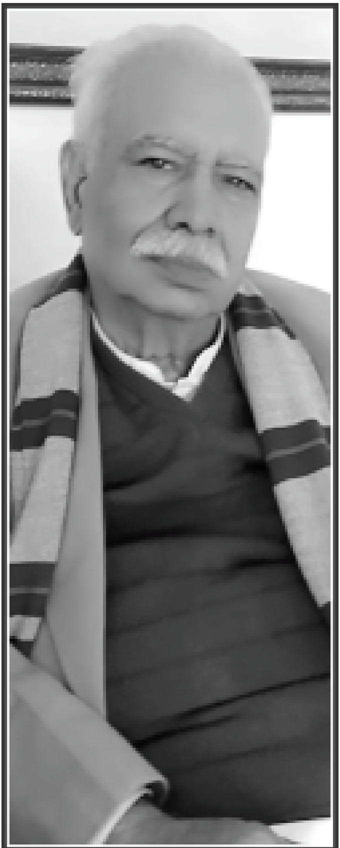

اکرام الحق سرشار

دلِ افسردہ کو ظلمت سے بچاؤ اب تو
سائے میں دھوپ کا پیوند لگاؤ اب تو

گر مری شاخ کو ایندھن ہی بنانا ٹھہرا
اس محبت سے مجھے پھر نہ اگاؤ اب تو

سال کے سال ہی سیلاب یہاں آتے ہیں
اونچے ٹیلے پہ مکاں اپنے بناؤ اب تو

گیسوئے زیست الجھتے ہی چلے جاتے ہیں
کوئی سلجھی ہوئی تحریک چلاؤ اب تو

شہر کو چھوڑ گیا ہے وہ کبھی کا سرشار
جا کے صحراؤں میں آواز لگاؤ اب تو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یا تو ملال نہ کرنا یا اظہارِ ملال نہ کرنا
دیکھنا بازِ حسن میں خالد ایسی مجال نہ کرنا

غزل

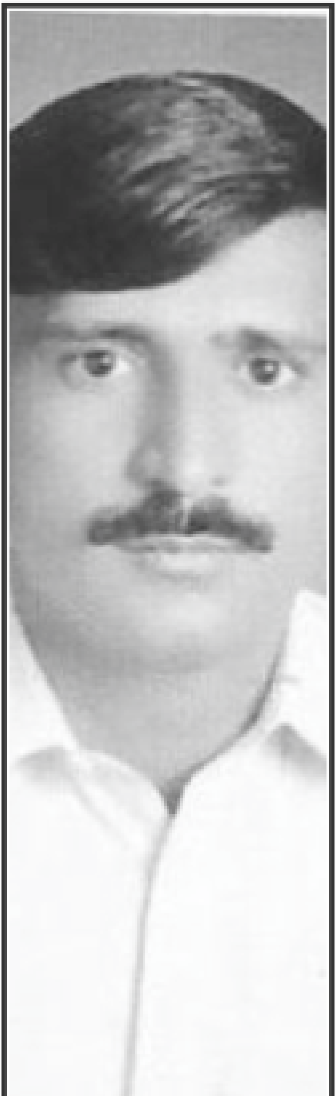

کسی کو چاند کسی کو ستارہ لگتا ہے
کبھی کبھی تو ہمیں بھی وہ پیارا لگتا ہے

کہ ماہتاب کو ہم اس لیے بھی دیکھتے ہیں
کسی کی آنکھ کا ہم کو اشارہ لگتا ہے

نہ جانے کس لیے تکلیف میں وہ رہتے ہیں
ہمارا نفع بھی ان کو خسارہ لگتا ہے

یہ خود فریبی عجب ہے کہ ہر کوئی ہم کو
ہمارا ہوتا نہیں ہے ہمارا لگتا ہے

قریب جانے کا کچھ فائدہ نہیں ہے دوست
کہ دور سے ہمیں دریا کنارہ لگتا ہے

شغف جو رکھتا ہو غالب کے ساتھ میر کے ساتھ
وہ شخص مجھ کو سخن کا مینارا لگتا ہے

ہمارا دل بھی عجب دل ہے کیا کریں اے دوست
جو پہلے لگ نہ رہا ہو دوبارہ لگتا ہے

سمٹ کے بیٹھنا ہوتا ہے اس لیے دانش
ہمارے ساتھ وہ بیٹھے تو پیارا لگتا ہے

اعجاز دانش

غزل

موت کا تو بہانہ ہوتا ہے
اک نہ اک روز جانا ہوتا ہے

پھول کلیاں سدا نہیں کھلتیں
زرد موسم نے آنا ہوتا ہے

تیر چاہے کہیں سے بھی آئے
میرا دل ہی نشانہ ہوتا ہے

ساتھ رہتا ہے جسم و جاں کا بھی
جب تلک آب و دانہ ہوتا ہے

کاروبارِ جنوں کے چلتے ہی
آدمی بے ٹھکانہ ہوتا ہے

یاد ہوتی ہے اُس قدر گہری
زخم جتنا پرانا ہوتا ہے

ہر گھڑی مسکراتا رہتا ہوں
درد بھی تو چھپانا ہوتا ہے

جو پرندوں کا گھر نہیں رہتا
اُس شجر کو گرانا ہوتا ہے

سال گذرا تو کیا ہوا آصف
اہلِ دل کا زمانہ ہوتا ہے

آصف شفیق

غزلیں

دل میں ارماں بہت مچلتے ہیں
کب حقیقت میں خواب ڈھلتے ہیں
یوں کی جھڑکیاں بھلانے کو
دوستو! آؤ گھر کو چلتے ہیں
کھا گیا جسم وقت کا دیمک
پھر بھی خوابوں کے دیپ جلتے ہیں
معجزوں کے تو ہم نہیں منکر
دل جو پتھر ہیں کب پگھلتے ہیں!
چند برسوں کی عشرتوں کے عوض
عمر بھر لوگ ہاتھ ملتے ہیں

جب کوئی اپنا چھوڑ جاتا ہے
اشک بے ساختہ نکلتے ہیں
ہے کرم زیست کے تھپیڑوں کا
جب بھی گرتے ہیں خود سنبھلتے ہیں
چند لمحوں کا پیٹ بھرنے کو
کتنے پھولوں کا خون کرتے ہیں

شیخ اقبال

آ گئے ہم کہاں خدا جانے
یہ جہاں ہے جہاں! خدا جانے
دل میں کیا کچھ ہے جانے کہنے کو
کب ملے گی زباں، خدا جانے
دل تو بٹ ہی گیا حسینوں میں
جاں بھی ہے میری جاں، خدا جانے
لوگ اب آسماں پہ بستے ہیں
ہے کہاں آسماں! خدا جانے
میں اکیلا ہوں دشتِ ویراں میں
کیا ہوا کارواں ، خدا جانے

لے اُڑا ایک ہی نظر میں کون
میرا نام و نشاں ، خدا جانے
جو نہاں ہے عیاں ہوا کب ہے
کب عیاں ہو نہاں ، خدا جانے
کس کے افسوں سے آج تک آباد
محفلِ این و آں ، خدا جانے

غزل

ساتھ گر چلتے نہیں راہ دکھاتے کیوں ہو
دور جا کر مجھے پھر پاس بلاتے کیوں ہو

تیری یادوں کا ہر اک نقش مٹا ڈالا ہے
آ کے خوابوں میں میرے مجھ کو ستاتے کیوں ہو

اپنا بن کر تو کبھی حال نہ پوچھا میرا
غیر بنتے ہو تو پھر ہاتھ ملاتے کیوں ہو

کس محبت سے لیا ہاتھ میرا ہاتھوں میں
تھام کر ہاتھ میرا خود ہی گراتے کیوں ہو

آندھیوں میں بھی نہ بجھنے نہ دیا ہم نے جس کو
اب وہی دیپ محبت کا بجھاتے کیوں ہو

تم تو کہتے تھے کہ تنہا ہی گزر جائے گی
شب کی تنہائی میں اب اشک بہاتے کیوں ہو

جس کو دیوانہ بنا ڈالا تھا تم نے اشفاق
اسی دیوانے پہ اب سنگ اٹھاتے کیوں ہو

محمد اشفاق بیگ

غزل

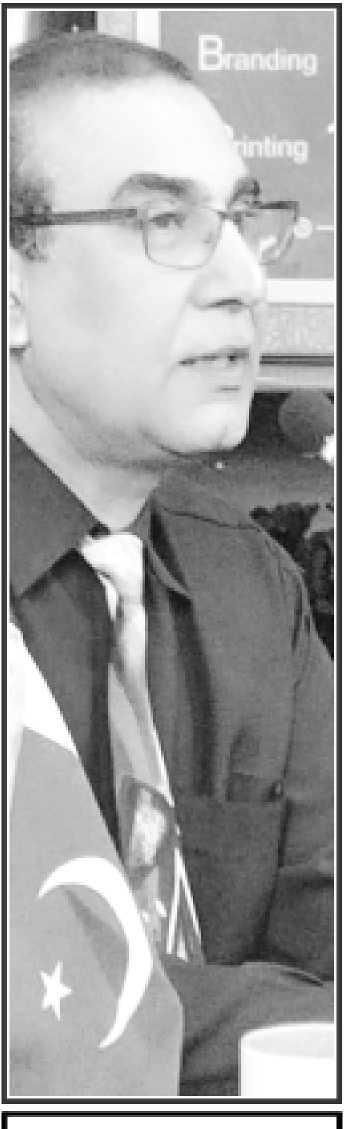

ملن کی آس پر رقصاں، ہیں خود سے بے خبر رقصاں
مسافر، رہ گزر رقصاں، ہوا رختِ سفر رقصاں

جسے گھر سے نکالا تھا، کبھی آ کر اسے دیکھو
ہے کیسے خاک سر رقصاں، ہے کیسے در بہ در رقصاں

خبر ہے ان کے آنے کی، ہمارے جاں سے جانے کی
ہے دل رقصاں، نظر رقصاں، لگیں دیوار و در رقصاں

کہا ہم نے نظر آؤ، کہا پردے میں رہنے دو
جو دیکھا عکس رہتا ہے، سرِ مژگانِ تر رقصاں

یقیں ہے چارہ سازی پر، تری بندہ نوازی پر
سو آیا ہے ترے در پر، یہ تیرا بے ہنر رقصاں

جنوں کا قرض ہے مجھ پر، میں ناچوں فرض ہے مجھ پر
میں رقصاں تھا، میں رقصاں ہوں، رہوں گا عمر بھر رقصاں

سنا ہے 'ارزنی' جب سے، صغیر احمد ہوں میں تب سے
بہت اونچی ہواؤں میں، بھلا کر خیر و شر رقصاں

صغیر احمد صغیر

غزل

زمیں سے دور کوئی رہ گزر بناتے ہیں
ہمارے پاؤں کسی کا سفر بناتے ہیں

وہ جن کے قلب میں احساس تک نہیں کوئی
وہ اپنے لفظوں میں پھر چشمِ تر بناتے ہیں

ہر ایک موڑ پہ کھینچی ہے بے بسی کی لکیر
ہر ایک موڑ پہ دیوار و در بناتے ہیں

نہیں ہے وسعتِ افلاک کوئی شے لیکن
زمیں پہ اپنی ضرورت کو پر بناتے ہیں

ستم ظریفی تو دیکھو کہ خوف کے مارے
ہم اپنے پاؤں میں خود راہ گزر بناتے ہیں

یقیں نہیں ہے ہمیں سایۂ فلک پہ سمن
ہم اپنے واسطے مٹی کا گھر بناتے ہیں

رخسانہ سمن

غزل

دشت کی ویرانیاں ہیں ہم سفر کوئی نہیں
اس اندھیری رات کی شاید سحر کوئی نہیں

جس پہ دستک دوگے آکر اے مرے پیارے حبیب
میرے گھر میں درد ہے دیوار و در کوئی نہیں

حُسن کی اس چاندنی پر یہ تکبر کیا ہوا
یہ تو اس کی دین ہے تیرا ہنر کوئی نہیں

وہ نہیں تو زندگی بے رنگ ہے بے کیف ہے
تشنگی ہے دھوپ ہے، سر پہ شجر کوئی نہیں

ہاتھ پر مہندی لگا لے ضد کی عادت چھوڑ دے
دیکھ میرے پاس اب خونِ جگر کوئی نہیں

وہ دیا روشن کرو جس سے جلیں لاکھوں چراغ
ورنہ گردوں پر کہیں شمس و قمر کوئی نہیں

جا بجا بکھرے ہوئے ہیں بے کفن لاشے مگر
میں غلام اُس کا مجاہد جس پہ سر کوئی نہیں

مجاہد سجاد

غزل

تیرا خیال آ گیا خار گلاب بن گئے
سارے ملال چھٹ گئے درد سحاب بن گئے

تو نے کہا کہ جاؤ اب دل میں مرے جگہ نہیں
راہ سے ہم پلٹ گئے رستے سراب بن گئے

اپنے ہی شہر میں ہیں آج اپنا نشان ڈھونڈتے
رشتے سراب ہو گئے خواب عذاب بن گئے

تم بھی ہو کچھ الجھ گئے ہم بھی ہیں کچھ الجھ گئے
خواب ہوئیں وہ صحبتیں جذبے عتاب بن گئے

تیری انا کے فیصلے تیرے لیے بھی بوجھ تھے
فاصلے کچھ یوں ہیں بڑھے تیرا حجاب بن گئے

خود سے بھی ہوں گریزپا اسکی طلب میں کیا کروں
لب پہ سجے یہ قہقہے میرا نقاب بن گئے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

ہر اک کو غم سنا کے رلایا نہیں گیا
کوشش کے باوجود بھلایا نہیں گیا

باتیں وہ ایسے کرتے ہیں جیسے ہوں پہلوان
کاندھے پہ جن سے بوجھ اٹھایا نہیں گیا

آتا نہیں ہے راگ کوئی پیار کا انہیں
لوری سنا کے جن کو سلایا نہیں گیا

کیسے وہ اس جہان سے نفرت مٹائیں گے
جن سے قلم بھی سچ کا اٹھایا نہیں گیا

جو لوگ لڑ رہے تھے زمانے کے واسطے
ان سے بھی اپنا آپ بچایا نہیں گیا

چہرے پہ مسکراہٹیں سجتی رہیں مگر
آنکھوں کا حال سب کو بتایا نہیں گیا

سچ بولنے کی قیمتیں معلوم تھیں مگر
لیکن کبھی بھی سچ کو چھپایا نہیں گیا

عابد جو دے گا سارے زمانے کو روشنی
ایسا کوئی چراغ جلایا نہیں گیا

عابد معروف مغل

غزل

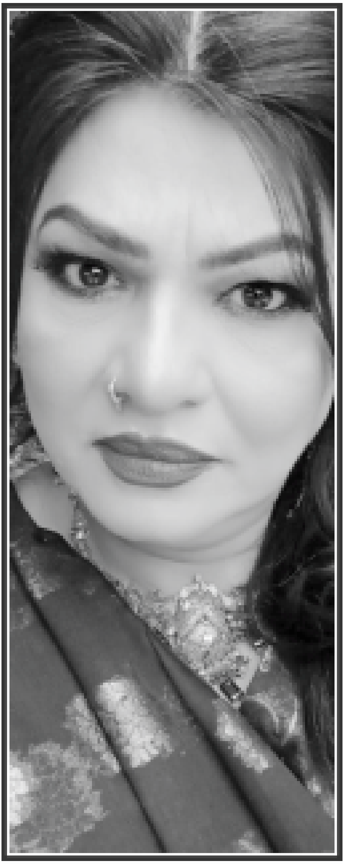

جیا قریشی

حاصل جو کمالات ہیں جائیں گے یہ چھن بھی
سو شکرِ خداوندی کی خاطر انہیں گن بھی

بے کیف شب و روز کا اک بوجھ اٹھائے
جینے کو تو جی سکتے ہیں ہم پیار کے بن بھی

ناداں ہی شک کرتے ہیں عظمت میں ہماری
عشاق میں شامل رہے انسان بھی جن بھی

مجبوریِ حالات کیے رکھتی ہے یکجا
چاہے ہمیں ہمراہ سے آتی رہے گھن بھی

عورت کے لیے مرد نے بدلا نہیں معمول
پنجرے ہی بناتا رہا آزادی کے دن بھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

غزل

درد بارِ دگر نہیں ہوتا
وہ اگر بے قدر نہیں ہوتا

ایسے گاہک ہیں جن کے کھیسے میں
خواب ہوتے ہیں زر نہیں ہوتا

ہاتھ جوڑے ہیں پاؤں پکڑے ہیں
غم اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتا

رہ میں ہوں رونقیں جہاں بھر کی
پھر مکمل سفر نہیں ہوتا

سب کو بس حُسن ہی نظر آئے
ہر کوئی خوش نظر نہیں ہوتا

چاندنی کیسے آئے لہجے میں
جب تلک میں قمر نہیں ہوتا

جس کے ذمے سنوارے رکھنا ہے
اسی عورت کا گھر نہیں ہوتا

اہم ہوتا ہے لفظ کا ادراک
بات کرنا ہنر نہیں ہوتا

یا بشر سے بشر ہی ڈرتا ہے
یا خدا کا بھی ڈر نہیں ہوتا

عشق افلاک کو ہلا بھی دے
پتھروں پر اثر نہیں ہوتا

ردا حاصل خلوص

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ سفر، سَر بہ سَر رایگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

غزل

جب بھی اُس کے بغیر ہوتا ہوں
اپنا ہوتا نہ غیر ہوتا ہوں

اُس زبردست یار کے آگے
پیش ہو کر بھی زیر ہوتا ہوں

جو سوا سیر میرے پیچھے پڑے
اُس کے آگے میں سیر ہوتا ہوں

خود کو دن بھر سنبھالتا ہوں میں
رات بستر پہ ڈھیر ہوتا ہوں

اپنی نظروں کے جام چھلکا دو
کب میں ساغر سے سیر ہوتا ہوں

بکھرے پھولوں کی طرح سر تا پا
اُس کے قدموں میں ڈھیر ہوتا ہوں ہوں

اُس کے آگے میں دل سے شرمندہ
جلد یا پھر بدیر ہوتا ہوں

سرفراز عارض

غزل

درونِ جسم و جاں کوئی نہیں تھا
جہاں تم تھے وہاں کوئی نہیں تھا

فقط جھوٹی اناؤں کے علاوہ
ہمارے درمیاں کوئی نہیں تھا

سکوتِ مرگ تھا میری صفوں میں
اگرچہ بے زباں کوئی نہیں تھا

ہمارے راز پوشیدہ ہیں کیونکہ
ہمارا رازداں کوئی نہیں تھا

محبت جاودانی تھی رہے گی
ہمیں میں جاوداں کوئی نہیں تھا

عجب سی بد گمانی چار سُو تھی
اگرچہ بدگماں کوئی نہیں تھا

وہاں بھی ہم رہے رقصاں و مستاں
جہاں پیرِ مغاں کوئی نہیں تھا

شبیر حسین بٹ

غزل

میں کہاں اپنے بَس میں ہوتا ہوں
جب تری دسترس میں ہوتا ہوں

میں خمِ چشمِ یار کا ہوں نشہ
کب نہاں جام ورس میں ہوتا ہوں

جذبۂ عشق ہوں لہو کی طرح
میں رواں ہر نفس میں ہوتا ہوں

میں فریبِ حیات ہوں جاناں
گُل ہوں پَر خار و خَس میں ہوتا ہوں

کُوچ کرنے کا میں ہوں آوازہ
میں صدائے جرس میں ہوتا ہوں

میرا صیّاد کوئی اور نہیں
میں انا کے قفس میں ہوتا ہوں

معظم علی خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

غزل

نشیبِ خون میں بھی دل کو ارجمند رکھا
میں سر بکف تھا مجھے تو نے سر بلند رکھا

شگفتِ گل میں ترا عکس باندھ لایا تھا
مثالِ خوشبوئے نادیدہ مشک بند رکھا

چلا افق سے جو شب کا سوار مشکی پر
چراغِ خفتہ تہِ حلقۂ کمند رکھا

شکستگی کے تماشے کو زندگی تو نے
ہماری چشمِ تحیّر میں عکس بند رکھا

زمیں کو کھینچ کے زیرِ قدم کیا اس نے
اور آسماں کو سروں پر بہت بلند رکھا

قضا و قدر رہی ممکنات کے مابین
نگار خانۂ امکاں کا بست و بند رکھا

اٹھا میں خاک سے مریخ و ماہ ساتھ لیے
ستارہ گاہِ فلک پہ مگر سمند رکھا

عابد رضا

غزلیں

تاب کیا لاتی میں کیفیتِ بحرانی کی
اس دفعہ دیدۂ خوں بار نے آسانی کی

پہلی فرصت میں دیا دیس نکالا اس نے
اسی دل سے کہ کبھی جس کی نگہبانی کی

دو گھڑی کے لیے ہنسنا بھی نہیں راس آتا
کوئی صورت نکل آتی ہے پریشانی کی

بجھتی آنکھیں ہیں تو بالوں میں ہے چاندی اتری
اسے تصویر کرن بھیجوں گی ویرانی کی

ایک بے درد کے قدموں پہ نچھاور کر دی
ہائے وہ عمر کہ جو عمر تھی نادانی کی

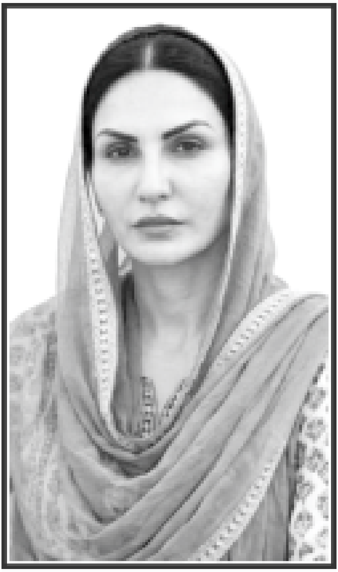

کرن گوندل

زندگی کوچۂ دلدار پہ وارے کوئی
جس طرح میں نے گزاری ہے گزارے کوئی

درمیاں ڈوب بھی جائیں تو اکٹھے ڈوبیں
خود اٹھا کر مجھے اُس پار اتارے کوئی

جس طرح میں نے ہر اک گام پہ آوازیں دیں
آرزو ہے کہ مجھے یوں ہی پکارے کوئی

کم سے کم اتنا تو اعزاز مرے نام کرے
مارنا بھی ہے تو خود ہاتھ سے مارے کوئی

اب تو چاندی نظر آنے لگی بالوں میں کرن
آس یہ ٹوٹ نہ جائے کہ سنوارے کوئی

غزل

خدا مجھے جو ترے خواب تک رسائی دے
تجھے حقیقتِ ناگفتنی دکھائی دے

کوئی تو آئے سمندر عبور کر کے یہاں
مجھے جزیرۂ مہجور سے رہائی دے

ترس رہا ہے پسِ چشم خوابِ نادیدہ
اسے براہِ کرم اذنِ رونمائی دے

تمام عمر مری کسبِ عشق میں گزرے
مجھے حلال کی ایسی خدا کمائی دے

مری طلب ہے کہ غرقابِ بے خودی ہی رہوں
مجھے تو بحرِ تحیر کی آشنائی دے

ملی ہے آنکھ تو مل جائے یہ رعایت بھی
میں جس کو دیکھنا چاہوں مجھے دکھائی دے

سجھائی کچھ نہیں دیتا خرد کے حلقے میں
مجھے تو دائرۂ کشف تک رسائی دے

لبھاتا ہے مجھے اک دلربا کا دل مولا
مرے سخن کو تو اندازِ دلربائی دے

جو من میں آئی سو کر دی، یہ عشق میں ہے روا
کسی کو بھی نہ یہاں اب کوئی صفائی دے

کوئی فرشتہ ہمارا پیامبر بھی ہو، جو
فلک نشیں کو زمیں زاد کی دہائی دے

جہاں پہ کام نہ آئے کوئی صدا احمد
یہ خامشی کا ہے خاصہ وہاں سنائی دے

احمد نواز

"عمودِ" ـــ ضمیر قیس

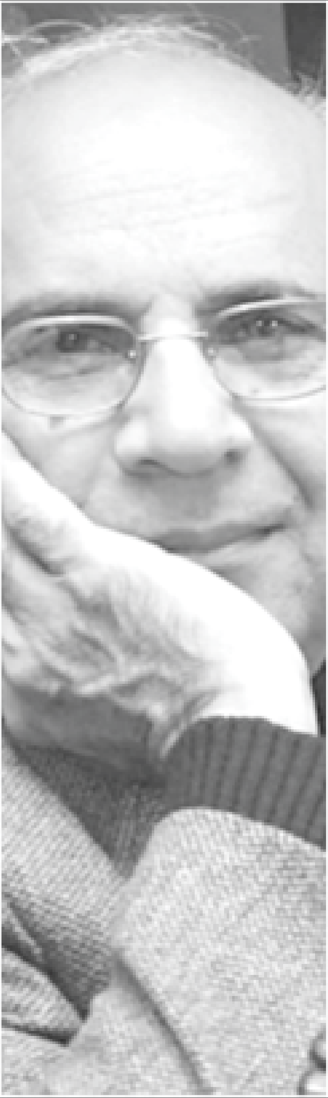

جلیل عالی

ضمیر قیس اپنے ایک شعر کے ذریعے اپنا تعارف یوں کراتے ہیں:

جہاں جہاں بھی مری دسترس میں آئی حیات
وہیں وہیں اسے منظوم کر لیا میں نے

....

تاہم قاری کو اس بات کا بھی بھرپور احساس ہوتا ہے کہ ضمیر قیس نے ہاتھ لگنے والے مفاہیم کو سخن کرتے ہوئے غزل غزل ہی نہیں، شعر شعر ہی نہیں، مصرع مصرع اپنے اسلوب خاص کی مہر ثبت کر دی ہے۔ اور یہ مہر اس کی مرغوب لمبی بحروں والی غزلوں اور درمیانی ومختصر بحروں والی ساری شاعری میں موجود ہے۔ البتہ اس کے اسلوب خاص سے لبالب غزلیں "عمود" کے آغاز میں درج ہوئی ہیں جو اس پہلو سے ذرا توجہ طلبی کا احساس دلاتی دکھائی دیتی ہیں اور فطری تخلیقی بہاؤ میں رچاؤ کے ساتھ اسلوبی عناصر جذب کرنے والی غزلیں ذرا بعد میں نظر نواز ہوتی ہیں۔ اب یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ ترتیب وارداتی دھماکے کی بلند آہنگی سے شائستگیِ اظہار کے سفر کی عکاس ہیں یا روایت کے توازن سے طرحدار اظہاری آغاز کی آئینہ دار۔ ان کی تازہ و حالیہ

شاعری کی چال سے درست نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی پہلی نظر میں ان کے کلام کی ندرتِ بیان ہی متوجہ کرتی ہے۔ بعد میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ندرت نمائشی نہیں بجا طور پر ان کے مختلف اور الگ طرزِ فکر و احساس کی دین ہے۔ مظاہر کی گہرائی میں اترنے، کریدنے اور غیر روایتی نتائج تک پہنچنے کا نقیب فکر و احساس۔ انھیں قدرت نے اختراعِ الفاظ کی صلاحیت بھی ارزانی فرمائی ہے اور اندرونی قوافی کا اہتمام بھی ان کے اسلوبِ خاص کا ایک اہم جزوِ ترکیبی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کا اصلی تخلیقی و جمالیاتی جوہر احساساتی و لسانی حیرت خیزی میں ہی مضمر ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پہلا خود میں تہلا، بہلا مانو گنتی بنتی سے
میرے باہر دوجا کوئی، تیجا ہے اندر کوئی

خوش باش زمزموں کی رسالت کے غم نہ پوچھ
ماتم کی لے ملائی پڑی اطلاع میں

اک دوسرے کو ٹھیک سے رخصت کریں گے ہم
فرصت جو مل گئی ذرا جشنِ وداع میں

ہم ایسے قرب کے زخموں سے چور تھے کہ ضمیر
کسی کا اب تو بچھڑنا بھی اندمالیہ تھا

اور اس سے تری وحشت غیب کا لذت چکھے، چکھنی ہے، وفور ہو جائے
یہ ممکن ہے اندھیرے میں بھٹکتے لمس رو دیں ہوں، خدا محسوس ہو جائے

فسردہ لوگ شہادت پسند کرتے تھے
فقط غموں سے ہی غم کا مداوا ہوتا تھا

سمندروں کی مسافت میں یاد آئیں گے
یہ چند پیاسے پرندے یہ اک اداس کنواں

بس ایک لمحہ تھا مجسم کر دیا جس نے مجھے
بس ایک موسم تھا پلٹ کر جو مری کایا گیا

بیٹھے ہیں کشتیوں میں خدا سے فرار لوگ
ملاحو احتیاط حدِ رودِ نیل ہے

خلق بھی کرتی خدا بھی نہیں ہوتی ہے ضمیر
ماں کے جیسی بھی زمانے میں کوئی ہستی ہے

آنکھوں کو موسموں کی دعا لگ نہیں رہی
منظر نظر کو کوئی حسیں مل نہیں رہا

ضمیر اس چشمِ خفتہ خواب میں ہلکا ہوا دل
طبیعت، نیند سے جاگا تو، بھاری ہو رہی تھی

....

ملوں گا تجھ سے کسی کوئے ماورائی میں
مرا پڑاؤ ابھی دشتِ ہست و بود میں ہے

....

اور پھر اک ساتھ دھرتی پر ہوئے آباد ہم
جستجو، وحشت، مروت، ابتلا، ابلیس، مَیں

....

کنویں کی گہرائی تک نہ پہنچی تھی سوچ لیکن
گڑھوں میں بارش کا آب افکار بھر رہے تھے

....

جیسی پڑی ہوئی ہو پیالے میں کائنات
اور دائرے میں بیٹھے ہوئے ہم نشست لوگ

....

شب نہ جانے کیا الاؤ سے کہا دل نے کہ صبح
برف میں پایا گیا چنگاریاں بوتا ہوا

....

کیسے کیسے کرب لے کر ہجرت چاک سے آ پہنچی
ریت پہ ناقہ تیر رہا ہے پانی پر پیراک چلے

....

وہ جگہ بھی مری کھڑکی سے ہی دکھتی ہے جہاں
داستاں، چاند، فلک، خواب، زمیں ملتے ہیں

جگ مگ کرتے لگ بھگ سب جگ ڈگمگ چلتے جائیں
ڈگ ڈگ گائے فتنہ کوئی ٹپ ٹپ ڈگا ناچ

....

بغور سن کے پرندوں کی گفتگو کچھ دن
عبورِ دجلۂ مفہوم کر لیا میں نے

....

میں ابھی ابھی تو شباب اوڑھے اڑا تھا اس کی منڈیر سے
وہ ابھی ابھی یہاں تھک کے بیٹھی تھی پر جو چاند میں کات کر

....

انگلی کاٹ کے نوحہ لکھا صدیوں کی دیواروں پر
چھیدوں سے ٹپکا ہے سورج گھر کی چھت پر کائی ہے

....

یہ اور بات کسی کو یقیں نہیں ورنہ
ہمارا عجز قلندر نہ بوالہوس کم ہے

....

یہ تو دیوار سے لگ کے جانا ہے اب
کیسے جھیلے ہیں حالات تصویر نے

....

جو نہ ٹوٹے ہوں اس خواب کا آئنہ
جو نہ دیکھا گیا اس کی تعبیر ہوں

....

تصویر ٹانگنی ہے کسی اعتبار کی
دیوارِ دل میں کیل کہیں ٹھک نہیں رہا

....

تمام لہریں اسی کی طرف روانہ تھیں
بس اتنا زور ہی پانی پہ چل رہا تھا مرا

☆☆☆☆☆

راولپنڈی میں ارتقائے شعروادب کا اجمالی جائزہ

خاور اعجاز

سلطان شادمان خان راولپنڈی کی ادبی روایت سے جُڑا ایک معروف نام ہے۔ وہ سلطان سارنگ خان کے خاندان سے تھے اور قلعہ پھروالہ کے گکھڑ قبیلہ سے تعلق تھا۔ یہ قلعہ لہتراڑ روڈ پر چراہ گاؤں کے قریب واقع ہے اور پوٹھوہار کا ایک تاریخی ورثہ سمجھا جاتا ہے جسے گکھڑ قبیلہ کے سربراہ کرنل سلطان ظہور اختر نے ۱۹۸۰ء میں آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کیا۔ یاد رہے کہ معروف گلوکارہ حدیقہ کیانی انھی سلطان ظہور اختر کی بھتیجی ہیں۔ سلطان شادمان خان کا فارسی دیوان ۱۸۵۵ء میں ''دیوانِ شادمان'' کے نام سے شائع ہُوا۔ شنید ہے کہ شادمان خان ''نسیمِ سحر'' تخلص کرتے تھے۔ اُن کی شاعری میں رومانوی رنگ کے پہلو بہ پہلو خطہ کی مقامی ثقافت اور حب الوطنی کے عناصر بھی نمایاں ہیں۔

راولپنڈی کے علاقہ لالکڑتی میں موجود ایک پائیں باغ منشی محمد شفیع شاہد اجبالوی اور محمد اکبر خان گرامی (۱۸۲۸ء-۱۹۳۳ء) کی بدولت پہلے پہل ادبی ماحول کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہُوا جب کہ راولپنڈی میں ہندکو پنجابی شاعری کی شمع احمد علی سائیں پشاوری (۱۸۳۷ء-۱۹۳۳ء) کی

بدولت فروزاں ہوئی۔ وہ اُردو اور فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ سائیں نے رمضان رمضو (۱۸۱۶ء - ۱۸۹۸ء) سے اصلاح لی جن کا بسلسلہ روزگار راولپنڈی میں بھی کچھ عرصہ قیام رہا۔ سائیں کی آمد سے قبل اُس دور کے ایک پنجابی شاعر گوہر کا ذکر "راول دیس" میں عزیز ملک نے کیا ہے۔ پنجابی شاعر میاں بردا پشاوری (۱۸۲۷ء - ۱۸۹۷ء) نے بھی کچھ وقت راولپنڈی میں گذارا۔ راولپنڈی میں سائیں کے ہمعصروں میں منشی رجب علی جوہر (۱۸۶۲ء - ۵ فروری ۱۹۴۷ء) کا نام نمایاں ہے۔ پنجابی کے علاوہ اُردو، فارسی، پشتو اور کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔ جوہر کے معروف شاگردوں میں محمد علی نامی (۱۸۵۷ء - ۱۹۶۳ء)، سائیں فیروز دین تنگین گجراتی (۱۸۶۵ء - ۲۸ دسمبر ۱۹۶۸ء)، غلام نبی کامل (۱۸۸۰ء - ۱۹۵۵ء) اور عبدالکریم ہمسر (۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸ء) شامل ہیں۔ نامی پنجابی شاعر تھے لیکن اُردو پر بھی دسترس حاصل کر لی تھی۔ فیروز دین، سائیں اور تنگیں دو تخلص کرتے تھے۔ اُنھوں نے ۱۹۲۳ء میں قصہ سوہنی مہینوال منظوم کیا جسے اس عنوان پر ایک عمدہ اور اعلیٰ تصنیف مانا جاتا ہے۔ اکثر پنڈی آتے تھے۔ فضل الٰہی فضل اور لطیف گجراتی اُن کے شاگرد ہوئے۔ لطیف گجراتی کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی جن میں اشفاق شاہین، ثاقب آکاش، راحت ملک، رمضان صائب، سیف الرحمان سیفی، شاہد رضا، غلام مجتبیٰ اور محمود اسیر معروف ہوئے۔ غلام نبی کامل پنجابی کے قادر الکلام شاعر تھے لیکن اردو زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔ مرزا عبدالکریم ہمسر کے خاندان نے کسی وقت پنڈی آ کر بوہڑ محلہ میں رہائش رکھی۔ ہمسر کمیٹی محلہ میں گھوڑوں کی زین اور نعل بندی کا کام کرتے رہے۔

سائیں کے پنڈی وال شاگردوں میں کیدار ناتھ سوز (م ۱۹۱۵ء)، عنایت حسین اسیر (م ۱۹۲۳ء)، ساقی (م ۱۹۴۷ء کے قریب)، اللہ داد چنگی (۱۸۸۹ - ۱۹۵۴ء)، چوہدری محمد خان ذاکر (م ۲۳ جولائی ۱۹۶۲ء)، نذر حسین شاہ مضطر (م ۱۹۶۶ء)، مضمر تاتاری (پیدائش بیسویں صدی کی پہلی دہائی) شانگ رام سوز، سید لال شاہ اور عزیز ترلائی کے علاوہ گردو پیش کے دیگر علاقوں سے پیر فضل گجراتی، اللہ دتہ جوگی جہلمی، گھائل، استاد یونس اور مسکین کے نام بھی آتے ہیں۔

کیدار ناتھ سوز خطۂ پوٹھوہار سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا تذکرہ مقامی طور پر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دسویں کا امتحان دے کر مشن سکول راولپنڈی سے نکلے کہ لنڈے بازار میں مینا کماری نامی ایک

حسین لڑکی پر نظر پڑی تو وہیں دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ لڑکی نے جھوٹے منہ ملنے کا وعدہ کر لیا لیکن پلٹ کر نہ آئی۔ سوز کو والدین زبردستی گھر لے آئے لیکن دُوسرے دن اُنھوں نے خودکشی کر لی۔

سوز ہو گیا خاک دی کُھک اج توں
گئے شکوے شکایتاں مُک آج توں

....

گئے عشق والے جھگڑے چُک اج توں
توں بھی چھُٹ گیا ایں وار و مدار کولوں

....

عنایت حسین امیر گلی ملیاراں کے رہنے والے تھے۔ تعلیم یافتہ نہ تھے۔

ہے عیاں ابلیس دا حال سبھ تے
جو درکاریا گیا دربار کولوں

توں امیر منظور کر خاکساری
پایا فائدہ کس نے ہنکار کولوں

....

ساقی اَن پڑھ تھے اور پیشہ کے لحاظ سے نائی تھے پھر یہ کام چھوڑ کر آلو چھولے بیچنے لگے۔ پنڈی میں ہی فوت ہُوئے۔

اج کل اس پنڈی شہر اندر
لڑکے حسن دا گرم بازار رکھدے

پہن ٹوپیاں کوٹ پتلون لیندے
گیسو چمن پا کے مشک مار رکھدے

اللہ داد چنگی ہری پور ہزارہ کے تھے۔ احمد علی سائیں کے زمانے میں پنڈی آ گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سائیں نے ہی اُن کا تخلص چنگی تجویز کیا تھا۔ یہ بھی اَن پڑھ تھے۔ شادی کی لیکن بے اولاد رہے۔ روایتی بیت بازوں کی طرح اپنے اشعار سے پہلے استاد سائیں کے بیت ضرور سناتے تھے۔

دُکھاں گھیریا سُکھاں دی بات کوئی نئیں
دن ولیاں وچ غماں بن رات کوئی نئیں

دل دی بیٹھک وچ بنا ظلمات کوئی نئیں
نئیں گئی روشنی روشن ضمیر وچوں

....

محمد خان ذاکر بلحاظ پیشہ کرکٹر تھے۔ بوہڑ محلّہ کے باسی تھے اور ۵۰۱ ورکشاپ میں بطور فٹر کام کرتے تھے۔ گکھڑ کیانی خاندان سے تعلق تھا جو ضلع جہلم سے پنڈی آ کر آباد ہُوا۔ ڈھوک کھبہ قبرستان میں مدفون ہیں۔

کراں غمزہ جا کے فریاد کس دی
حامی کار وی میرے سی عار کر دے

ذاکر رہندے نئیں او کسی بات جوگے
ایہ حسین جیہناں سنگ پیار کر دے

....

سید نذر حسین شاہ مضطر نواں محلّہ کے باسی تھے۔ تعلیم زیادہ نہ تھی۔

ہویا اس قدر زار و نحیف جے تیں
طبع رُک گئی آب و غذا کولوں

کیتا جس نے لاچار بیمار مضطر
پاساں فیض اسی مسیحا کولوں

....

یہ شعر میر تقی میر کے عطار کے لڑکے سے دوا لینے والے شعر کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔
مضطر تاتاری کسی مدرسہ یا سکول سے رسمی تعلیم یافتہ نہ تھے، محنت مزدوری کر کے گذر بسر کی لیکن وہ فطری طور پر شعر و شاعری کی طرف راغب تھے۔ میر انیس سے متاثر ہو کر ہندکو زبان میں مصرعے موزوں کرنے شروع کیے، پھر سائیں احمد علی کے مشورے پر اردو شاعری کی جانب ملتفت ہوئے اور رومانی شاعری شروع کی جس میں روایتی خیالات کو ندرتِ فکر کے ساتھ بیان کرنے کی سعی کی ہے:

زمانے کو ہرا سودائے سر دے
جہاں کو مجھ ہی سا دیوانہ کر دے

طلسمِ خوابِ مسلم جس سے ٹوٹے
مرے نالوں میں یارب وہ اثر دے

....

پنجابی شعرا میں پیر مہر علی شاہ (۱۴ اپریل ۱۸۵۹ء۔ ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء) کا بڑا مقام ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۲۳ واسطوں سے سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں منعقدہ جارج پنجم کے دربار میں حاضری سے معذوری اور انکار کی وجہ بتانے کے لیے انگریز کمشنر راولپنڈی کے دفتر میں طلبی سے گریز کی پاداش میں حکومتِ برطانیہ نے آپ کو جلاوطن کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو پہلی جنگِ عظیم کی نذر ہو گیا۔ پیر صاحب پنجابی اور فارسی میں اعلیٰ متصوفانہ کلام کے علاوہ متعدد نثر پاروں کے بھی خالق تھے۔ ان کے یہ پنجابی اشعار نہایت معروف ادب پاروں میں شمار ہوتے ہیں:

اج سک متراں دی ودھیری اے
کیوں دلڑی اداس گھنیری اے

لوں لوں وچ شوق چنگیری اے
اج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں

....

۱۹۰۵ء میں جامع مسجد راولپنڈی کی تعمیر مکمل ہوئی۔ جمعہ کے افتتاحی موقع پر پیر مہر علی شاہ بھی تشریف لائے۔ اس مسجد کو رونق بخشنے والوں میں مولانا ظفر علی خان اور سید عطا اللہ شاہ بخاری جیسے آتش بیان خطیبوں کے اسمائے گرامی بھی آتے ہیں۔
سید غلام محی الدین (دسمبر ۱۸۹۱ء۔ ۲۲ جون ۱۹۷۴ء) پیر مہر علی شاہ کے اکلوتے فرزند

تھے اور وہ اُنھیں ''بابو'' کہا کرتے تھے جس کے سبب یہ بابو جی مشہور ہوئے۔ غلام معین الدین شاہ مشتاق (۱۹۲۰ء۔ ۱۹۹۷ء گولڑہ) المعروف بڑے لالہ جی اور شاہ عبدالحق گیلانی (۱۲ اپریل ۱۹۲۶ء - ۳۰ جولائی ۲۰۲۰ء) عرف چھوٹے لالہ جی پیر مہر علی شاہ کے پوتے تھے۔ معین الدین مشتاق کا مجموعۂ کلام ''اسرار المشتاق'' حمد و نعت، مناقبِ اولیا اللہ کے علاوہ غزلیات اور منظومات پر مشتمل ہے۔

مجموعۂ کلام ''اسرار المشتاق'' مطبوعہ: لاہور، فروری ۱۹۹۹ء کی غزلیات سے انتخاب:

آرزوئے وصلِ جاناں میں سحر ہونے لگی
زندگی مانندِ شمع مختصر ہونے لگی

رازِ اُلفت کُھل نہ جائے، بات رہ جائے مری
بزمِ جاناں میں الٰہی چشم تر ہونے لگی

اَب شکیبِ دل کہاں حسرت ہی حسرت رہ گئی
زندگی اِک خواب کی صورت بسر ہونے لگی

....

آئندہ پھر نہ آئے کبھی ہجرِ یار میں
جی چاہتا ہے آگ لگا دُوں بہار میں

بخشش ہُوئی تو اہلِ ندامت کی حشر میں
تسبیح زاہدوں کی نہ آئی شمار میں

....

پھراتا در بدر ہے کو بہ کو دردِ جگر مجھ کو
ٹھہرتا ہے تو پہنچا کر اُسی ظالم کے گھر مجھ کو

کبھی راتوں کو چھپ کر بھی جو اُس کوچہ میں جاتا ہوں
تو کیا آنکھیں دِکھاتے ہیں چراغِ رہگزر مجھ کو

....

نشانِ کشتۂ انداز پوچھنے والے
یہ تیری راہ میں کس کا غبار رہتا ہے

....

ہر جور و ستم جس کو گوارا نہیں ہوتا
وہ چاہنے والا ہی تمھارا نہیں ہوتا

سُن پائے اگر ہجر میں تقریر کسی کی
باتیں ابھی کرنے لگے تصویر کسی کی

....

زمانے میں نہیں راحت کسی کو
وہی ہے شاد جس کے دل میں تُو ہے

....

اے تصور میں رہنے والی شکل
بات بھی گاہ گاہ کرتے ہیں

....

اِک اُسی کا پتا نہیں معلوم
اور بندے کو کیا نہیں معلوم

....

دل سے مشتاق ذکرِ ہُو کیجے
یہی کنجی ہے ہر خزانے کی

....

بنا لیتا ہے وہ اِک پل میں اپنا
نظر مشتاق ہے اُس کی بلا کی

بناتے ہیں کس کس کو دیوانہ دیکھو
یہ گیسو بہت سر چڑھائے ہُوئے ہیں

....

ہاتھ کیوں رکھ رہے ہو کانوں پر
حالِ دل تو ابھی سُنا ہی نہیں

....

نگاہوں سے بھی غائب ہوگیا کوئی تو ہوش آیا
کہ اِن کم بخت ہاتھوں سے وہ دامن دُور ہی کیا تھا

....

۱۸۹۶ء میں اسلامیہ سکول کا قیام عمل میں آیا جہاں ۱۹۳۰ء کے اردگرد ہونے والے سالانہ جلسوں میں حفیظ جالندھری بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ غالباً جوہر اور کامل کی مساعی سے ہی ۱۹۲۳ء کے اردگرد باغ سرداراں میں مخلوط مشاعروں کا آغاز ہُوا۔ اُردو کے رواج میں منشی عطا محمد طاہر کا نام اوّلیت کا حامل ہے۔ اُن کے قافلہ میں عبدالعزیز فطرت، انجم رضوانی اور آغا صدیق حسن ضیا نمایاں تھے۔ عبدالعزیز فطرت کی ''بزمِ ادب'' نے راولپنڈی میں تادیر بے مثال ادبی خدمات انجام دیں ۔ اسی دوران عبدالحمید عدم کی راولپنڈی آمد اور اُن کی قائم کردہ ''بزمِ اردو'' کا چرچا بھی رہا۔ سیماب اکبر آبادی کی پاکستان ہجرت نے اکبر آباد کے بیشتر شعرا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جن میں راولپنڈی میں موجود اکبر آبادی شعرا کی نمایاں تعداد موجود تھی۔

عزیز ملک نے اپنی کتاب ''راول دیس'' میں ایک ڈاکٹر بشارت علی کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۳۵ء میں برلن سے سیاسیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آئے تھے اور راولپنڈی میں اُن کے پڑوس میں کہیں ٹھہرے۔ مقامی شعرأ سے تعارف کی غرض سے عزیز ملک نے اُنھیں تلوک چند محروم، آغا ضیا، عبدالعزیز فطرت ، عبدالحمید عدم، علامہ ریاض الحق عباسی اور عزیز صہبائی وغیرہم سے ملوایا۔ اِس بیان سے ظاہر ہُوا کہ یہ تمام احباب ۱۹۳۵ء کے اردگرد راولپنڈی میں مقیم تھے۔ تلوک چند محروم راولپنڈی کی ادبی فضا سے متاثر ہُوئے۔ عزیز صہبائی کا وطن امرتسر تھا اور وہ پشاور میں ملازمت کرتے تھے۔ آغا حشر کے شاگردوں میں سے تھے۔ گویا تقسیم سے قبل بھی پنڈی کی ادبی فضا نہایت مستحکم تھی۔ تقسیم کے بعد قیامِ پاکستان سے پہلے کے شعرأ کی قیادت میں ادبی قافلہ ایک نئے دور میں داخل ہُوا اور افضل پرویز، ایوب محسن، غلام رسول طارق اور یوسف ظفر جیسے ادبی رہنماؤں کے جلو میں نئی منزلوں کی جانب گامزن ہُوا۔

☆☆☆☆☆

نوید ملک کے نعتیہ مجموعے "سبز اُڑان" کی درویشانہ و مجذوبانہ پرواز

کئی عشروں سے تخلیقِ شعر، تنقیدِ شعر اور مختلف اصناف نثر و شعر میں مصروف میرے بہت عزیز دوست نوید ملک سے میرا اتنے ہی عرصے سے گہرا اور قلبی تعلق ہے اور میں ان کے تخلیقی سفر کے آغاز سے لے کر ارتقائی سفر کا عینی شاہد بھی ہوں۔ وہ ایک بہت ہی درویش صفت، نرم خو، جمالی انداز کے قلمکار ہیں جن پر کبھی کبھی جلالی کیفیت محض لمحاتی طور پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہ جلالی کیفیت اس وقت طاری ہوتی ہے جب کوئی ان کے درست موقف سے برائے بحث اظہارِ اختلاف کرے۔ مگر پھر اگلی ملاقات میں محسوس ہوتا ہے کہ چھوڑیے رات گئی، بات گئی:

میں نعت لکھتے ہوئے جھلملایا پہلے نوید
پھر اس کے بعد چراغوں پہ بھی جلال آیا

....

نوید ملک سے کوئی دو عشروں سے دوستی ہے، ادبی اور ذاتی حوالوں سے بھی تقریبات اور محفلوں میں ملاقاتیں ہوتی ہیں بل کہ ان کے چند قریبی احباب کے ساتھ ہماری اکثر ایک طویل نجی نشست بھی ہوتی ہے جہاں انسان کے ادب آداب اور ماحول کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کی ذاتی زندگی میرے قریبی مشاہدے کے مطابق، جو ہمیشہ سے ایک نیک خو اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے والے مسلمان کی تھی، اب مکمل طور پر اُس ظاہری اور باطنی سانچے میں ڈھل گئی ہے جو اسلام کے آغاز کے وقت کے مسلمانوں کا خاصہ تھا۔ چنانچہ ان کی نعتیں ان کے تخلیقی وفور کے ساتھ ساتھ ان کی سچائی کا مکمل اظہاریہ اس لیے بھی ہیں کہ وہ حضور کی سیرت و کردار پر اور ان کی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل پیرا ہیں، عشقِ رسولؐ ان کی زندگی کی ہر سانس اور ہر عمل میں ہے تو ان کی نعت گوئی بھی ایک کیف و سرور کی الوہی

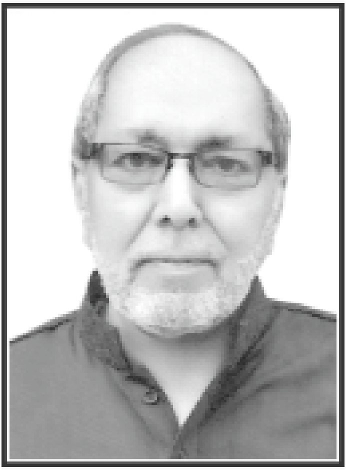

نسیم سحر

نشاطیہ کیفیت میں ڈھل گئی ہے۔ ان سے مل کر ہر صاحب نظر کو ان کی مکمل طور پر اسلامی طرز حیات کا احساس ہوتا ہے۔

تاحال میرے علم کے مطابق نوید ملک کے مجموعوں میں دو غزلیہ مجموعے 'اک سفر اندھیرے میں' اور 'تاب دان'، دو نظموں کے مجموعے 'کاسنی' اور 'ارتعاش'، ایک طویل نظم منقوش اور ایک بالکل مختلف ترتیبی انفراد کے ساتھ لکھی ہوئی کتاب اوزان ڈائری شامل ہے جو نئی نسل کے ساتھ ساتھ ان شعرا کے لیے بھی قابلِ مطالعہ ہے جو اوزان سمجھنے کے آسان طریقے مناسب طریقے سے سمجھ کر دنیائے شاعری میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

درج بالا کئی اصناف میں لکھنے اور کئی کتب کی تصنیف کے بعد مقام فخر و عطا ہے کہ اس نوجوان اور جواں فکر شاعر نوید ملک کا بتدریج سفر" جزوی" کے بجائے "کلی" طور پر نعت گوئی کی جانب ہو گیا ہے جو بلا شبہ ان کی قلب ماہیت کا خوش آیند تقدیسی اعلان ہے۔ اب وہ دیگر تمام شعری اصناف سخن مکمل طور پر ترک کر چکے ہیں اور اس خطے کا تمام اسلوبیاتی حسن، جمال، موضوعاتی تنوع اپنے ساتھ لے کر خطہ نعت کر نعت میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ خطہ نعت میں داخلہ صرف ایک تخلیقی و تقدیسی اظہار کا داخلہ نہیں ہے بل کہ نوید ملک کی شخصیت میں جو مذہبی رنگ جھلک رہے ہیں ان کا عملی اظہار بھی ہے۔ جیسی درویشیت اور کہیں کہیں مجذوبیت ان کی شاعری میں ہے، ویسی ہی ان کی زندگی کے شب و روز میں بھی روز بروز بتدریج اجاگر ہو گئی ہے۔ اس دعوے کی دلیل کے طور پر یہاں ان کے چند عمدہ اشعار ملاحظہ ہوں:

پہنچے اُحد تو ہم پہ بھی اسرار کھل گئے
مجذوب پتھروں نے دکھائے جگر ہمیں

....

نعت گوئی کے تقدیسی خطے میں عملی طور پر ہمہ وقت مقیم رہنے کی برکات کے تحت ان کی تقدیسی شاعری میں وہ وفور، تاثیر اور کیفیات منعکس ہو رہی ہیں جو کسی بھی نعت گو شاعر کے لیے قابلِ رشک اور قابلِ تقلید ہوتی ہیں۔ انھی تخلیقی و تقدیسی کیفیات کے امتزاج کے ساتھ نئے موضوعات اور متنوع بحور میں، اچھوتی ردیفوں اور کم مستعمل قافیوں کے ساتھ انھوں نے نعت نگاری کے منظر نامے میں اپنے نعتیہ مجموعے کے ذریعے اپنی نمایاں جگہ بنالی ہے۔ جمالیاتی حسن کے ساتھ فکری و موضوعاتی تنوع نے وہ کمال دکھایا ہے کہ نئے لہجے کے غزل گو شعرا بھی

نعت گوئی میں ان کی کامل دسترس کے قائل اور معترف ہو جائیں۔ ان کے چند منتخب اشعار میں اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ ذہنی اور روحانی طور پر ایسا لگتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں روضۂ رسولؐ پر گنبدِ خضر کے سبز منظر نامے میں مقیم ہیں۔ ان کے کئی اشعار اس کیفیت کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

ہر گھڑی کی یہاں ٹک ٹک ہے جہاں سے افضل
لمحے لمحے نے پہن رکھی ہے دستار الگ

عطر ملتا ہے، کھجوریں ہیں مگر پھر بھی کیوں؟
خواب میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں بازار الگ

....

بادبانوں کی ضرورت نہیں رہتی ان کو
جو ترے ہو گئے ان کے ہیں کنارے سارے

....

حضورؐ موت مری راہ میں کہیں آئے
حضور آپؐ کی جانب کرے نوید سفر

....

مرے نبیؐ کے لیے جو بھی جھلملائے تھے
زمانے بھر میں وہی معتبر چراغ جلے

....

سبز ہو کر کوئی نسبت نہیں آقاؐ سے جنھیں
ایسے اشجار ہواؤں سے بھی کٹ جاتے ہیں

....

خزاں رسیدہ تمدن انھی سے بدلا نوید
کہ جو بھی سبز ہوئے سلسلے مدینے میں

مرے وجود میں کوئی شجر مٹھاس کا ہے
کھجور کھائی تھی جا کر کہیں مدینے میں

....

جلتی ہوئی قمیض میں ورنہ کہاں سکون
اس دھوپ کی فصیل میں سایا انھیؐ کا ہے

....

نوید ملک نے چراغ کی روشن اور تابندہ علامت استعاروں اور موضوعات میں مدینہ منورہ میں حضور اکرمؐ کی ضیائے ابد سے اخذ کی ہے۔

جدت ہر نوفکر شاعر کا سرمایہ ہوتی ہے، اور اگر یہ جدت اپنا اظہار اچھے طریقے سے کرے تو اس کے کلام میں وسعت کے ساتھ ساتھ جدید عہد کے ساتھ چلنے کا احساس بھی ہوتا ہے۔

اچھے نمبر ملے ان کی ہے عطا
پاس ہونے لگے پرچے سارے

....

ترے لیے ہی بنائے گئے سبھی چینل
زمیں کے ساتھ کرے نشر آسماں ترا ذکر

....

مجھے وہ اس لیے لگتی ہے اچھی، نعت پڑھتی ہے
جو چڑیا چھت پہ آ کے چہچہائی، یا رسول اللہ

لمحوں کی ہر کاپی ان کی خاطر کھولوں
بستے میری یادوں کے قربان انہیؐ پر

وہ عکس سارے مدینے سے ہو کے آئے ہیں
جو آئنوں میں ڈھلتے ہیں اعتماد کے ساتھ

....

دشت ہمارے سینوں کے قربان انہیؐ پر
اونٹ ہمارے جذبوں کے قربان انہیؐ پر

....

اسی طرح ایک محب الوطن پاکستانی کا جذبہ ان سے وطن کے لیے بھی نعتیہ شعر کہلواتا ہے:

ہیں پاکستان میں تیرے غلام ان کو نہیں ہے ڈر
کہ حملہ ہو زمینی یا فضائی یا رسول اللہ

....

حرمین شریفین اور ارض مقدس کی تاریخ کے علاوہ پاکستان کی تاریخ پر بھی ان کا گہرا مطالعہ ان کی تقدیسی شاعری میں جھلک رہا ہے۔ کچھ شعر دیکھیں:

نبیؐ کے بعد یمامہ میں جیتنے کے لیے
دلوں میں بچوں کے ڈالیں گے ڈر عقیدے کا

....

انہی میں ہے کوئی لیڈر مرے نبیؐ کا غلام
جو بیچے آج کسی غزنوی کے طالب ہیں

....

ایک نظم "درویش" کا یہ بند بھی کمال ہے۔ یہ پوری نظم پڑھنے کے لائق ہے کہ اس میں خلفائے راشدین کے اہم حوالے ہیں، یہاں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اپنی پیشانی بچھا، درویش بن
ایک دروازے پہ جا، درویش بن،

پیروی صدیق اکبر جیسی کر
اور نبی پر ہو فدا، درویش بن

جو عمر کے راستے پر ہیں رواں
جوڑ ان سے سلسلہ، درویش بن

جو کیا عثمان نے ویسا ہی کر
رب کی تجھ پر ہو عطا، درویش بن

جو علی والا ہے اس کے سامنے
اپنی آنکھیں مت اٹھا، درویش بن

....

ایک شعر کربلا کے بارے میں ان کا ایسا کمال ہے کہ یہ ایک مدت سے ہر مسلمان کی زبان پر کوفے کی صورت حال کے حوالے سے مچلتا رہتا ہے

کوفے کے بعد ایسی ہوا دل میں چل پڑی
ہم نے کسی بھی خط پہ بھروسہ نہیں کیا

....

یہاں علامہ اقبال جیسے عاشقِ رسول سے نوید ملک کی شعری کائنات میں انہی کا رنگ جھلک رہا ہے۔ ان کے مصرعے پر استغاثہ

عمدہ ہے۔مثال:

اللہ کرے ان کو خودی بھی ہو عطا اب
پہنے ہوئے بیٹھے ہیں جو دستار فضیلت

....

منصف ہو کہ مجرم ہو، رعایا ہو کہ لیڈر
کس کس کی کریں جا کے مدینے میں شکایت

....

ان کے تقدیسی کلام میں اچھی اور نئی ردیفوں کی کوئی کمی نہیں۔ چند ایسی ردیفیں سرسری طور پر منتخب کی ہیں دیکھیے، ورنہ ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے: آپؐ ہی کے طفیل، اُنؐ کے لیے، الگ، مرے شعر، مدینے میں،کوئی مسئلہ نہیں، عقیدے کا، میں لکھتا ہوں، رقص کرتے ہیں، مدینے کی بات کر، مدینہ دیکھا، انہیؐ کا ہے، قربان انہیؐ پر، یا نبی محتشم۔ان ردیفوں میں کہی گئی نعتیں قاری ان کی کتاب میں ملاحظہ کر کے یقیناً ان کے کمال فن کا اعتراف کرے گا۔

نئی شاعری روایتی شاعری سے کوئی الگ تھلگ چیز نہیں ہوتی، غزل اور نظم کے ڈھانچے کو، اور اسی حوالے سے نعت گوئی کے اسالیب کو تبدیل تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن ایک اچھے تخلیقی شاعر کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ انہی محدودات کے باوجود نئے الفاظ، لفظی تراکیب اور موضوعات کے ساتھ ایسے تخلیقی و تقدیسی اسلوب و پیرائے میں نعت گوئی کرے کہ اس کی شاعری روایتی شاعری سے یکسر جدا نظر آئے۔ چنانچہ شعری معائب سے بچ کر نعت کہنا اور شعری محاسن کا خیال رکھنا ان کا خاصہ بن چکا ہے۔ ان میں یہ دسترس اور فنی ہنرکاری غزل اور نظم گوئی میں ایک طویل ریاضت اور تخلیقی ریاض کے سبب آئی ہے جو کہ ماضی قریب تک ان کے تخلیقی اظہار کا نعت گوئی کے ساتھ ساتھ نظم و غزل گوئی میں جزوی اظہار تھا، اب، کہ وہ کلی طور پر نعت گوئی کے خطے میں داخل ہو چکے ہیں، تو اُن کی تمام تر تخلیقی قوت عشقِ رسولؐ میں ڈھل کر پورے تقدیسی و عقیدتی وفور کے ساتھ ان کی نعتوں کو زرخیز اور تصورِ اقبال کو ثروت مند کر رہی ہے۔

کوئی بھی نعت گو اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں سے حمد و نعت لکھنے کے باوجود کبھی مطمئن نہیں ہوتا، اور یہی نا مطمئن ہونا اس کو نعت گوئی کے نئے موضوعات اور اظہار عشق و عقیدت کے نئے زاویے تلاش کرنے پر مائل کرتی ہے۔ یہ عدم اطمینان ہی نوید ملک کے ارتقائی سفر کو ارتفاعی اسمات کی جانب لے جانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ میں نے ان کی نعتوں کے مسودے کو ورق در ورق، صفحہ در صفحہ ہی نہیں، بلکہ شعر در شعر بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے اور اُن کی ارتقائی رفعتوں اور تخلیقی وسعتوں کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ہر شاعر تخلیقی اظہار کے ساتھ ساتھ زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی سلیقے اور قرینے سے دوسری زبانوں کے الفاظ کو یوں استعمال کرتا ہے کہ وہ اجنبی نہ نظر آئیں بل کہ اردو زبان کا حصہ ہی بن جائیں۔ اس نسبت سے نوید ملک نے کہیں کہیں کچھ انگریزی الفاظ اور اجنبی لفظی تراکیب کا بھی عمدہ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے کچھ پنجابی لفظوں کا بھی برمحل استعمال کیا ہے۔

حسنِ تکرار کا شعروں میں استعمال کسی بھی شاعر کی شعری ہنروری ثابت کرتا ہے۔ نوید ملک اس شعری حسن کو یوں اپنے شعروں میں سموتے ہیں کہ یہ تکرار شعر کو بوجھل بنانے کے بجائے اس کی کیفیات کی شدت کو دوچند کر دیتی ہے:

یہ اظہاریہ تمام کرتے ہوئے میں اس درویش صفت شاعر کا ایک نمایندہ شعر پیش کرتے ہوئے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ کریم اور اس کے محبوب رسولؐ اللہ کے کرم اور فیض سے ان کے تخلیقی وفور کی توجہ صرف اور صرف تقدیسی شاعری پر ہی مرتکز رہے:

انھیں اپنی شہرت یا اپنے کلام کی تشہیر سے کوئی غرض نہیں، کہ وہ کسی دنیاوی فائدے کی کشش کے لیے نہیں لکھ رہے بل کہ صرف اور صرف رسولؐ اللہ اور محبوبِ الٰہی کی شان میں لکھ کر اپنی حبِ رسولؐ کا اظہار کر رہے ہیں، چنانچہ میں انھی کے ایک شعر کی نسبت سے اس درویش شاعر کے لیے صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ:

نوید ملک نے اس نعتیہ مجموعے کا پہلا عنوان درویش نعتیں رکھا تھا، مگر اب جو انھوں نے عنوان کو حتمی صورت ''سبز اڑان'' کی صورت میں دی ہے اس نے مجھے ان کی عقیدتی اور تقدیسی پرواز کی رفعت و سرشاری پر مزید قائل کر دیا ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرتبہ سفید براق کبوتروں کی پروازیں دیکھیں اور تصور میں ان کے ساتھ ساتھ اڑتا بھی رہا۔ مدینہ منورہ میں یہ بھی دیکھا کہ یہ کبوتر ایک طوافی کیفیت میں دائرہ بناتے ہوئے اڑ رہے ہیں۔ اب جب نوید ملک کی یہ روحانی سبز اڑان دیکھتا ہوں تو وہ مجھے گنبدِ خضر کے رنگوں میں نہایا ہوا ایک کبوتر ہی محسوس ہوتا ہے جس کی ہر پرواز عشقِ رسولؐ کی خوشبو اپنے پروں سے پھیلاتی جا رہی ہے اور ہم بھی اس کی اس سبز اڑان میں شامل ہو کر اس عود و عنبر کی خوشبو میں اس کی بدولت غسلِ نوری کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نوید ملک کو ایسی مزید کیفیاتِ عشقِ رسولؐ سے مالا مال کرے:

گلوں لگاؤں والے دھڑکنیں پڑھنے سے عاری ہیں
زمانہ دیکھتا ہے میری ثنائی، یا رسولؐ اللہ

☆☆☆☆☆

شعور کی پیچیدہ حقیقتیں اور کہانیاں

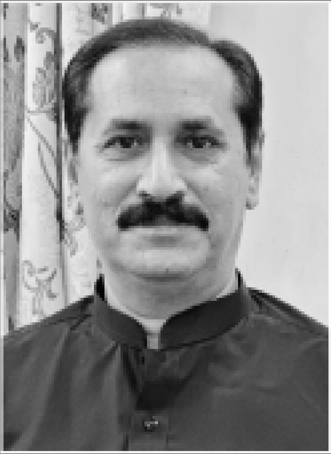

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ناصر عباس نیر نے اردو ادب میں سب سے پہلے ایک سنجیدہ، باخبر اور صاحب نظر نقاد کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی اور یہاں تک پہنچتے ہوئے کہیں ہمیں الجھایا، کہیں مشتعل کیا اور کہیں مرعوب، مگر جب انھوں نے افسانہ نگاری کی طرف رخ کیا تو یہ بات جلد واضح ہو گئی کہ وہ محض ایک نقاد کے طور پر افسانے نہیں لکھ رہے تھے بل کہ تخلیقی سطح پر ایک نئی جہت بھی دریافت کرنے چلے تھے۔ ان کے افسانے اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ گہرا مطالعہ، فکری ریاضت اور تخلیقی بصیرت جب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ادب میں ایک منفرد آہنگ پیدا کیا جا سکتا ہے اور وہ پیدا ہوا بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے روایت سے جڑے ہوئے ہونے کے باوجود روایت کے اسیر نہیں ہیں اور نئے امکانات پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں فکر، احساس، تخیل، تاریخ، نفسیات اور تہذیبی شعور کہیں باہم پیوست ہو جاتے ہیں اور کہیں کہانی پہلو میں چلنے والا ایسا عنصر ہو جاتے ہیں جس کی الگ سے تفہیم اور تعبیر شاید ممکن ہی نہیں تھی۔ ناصر عباس نیر کے اب تک پانچ افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں: 'خاک کی مہک'، 'فرشتہ نہیں آیا'، 'راکھ سے لکھی گئی کتاب'، 'ایک زمانہ ختم ہوا ہے'، اور 'جب

محمد حمید شاہد

تک ہے زمین۔ ان کتب پر مشتمل ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے جس کے آخر میں مصنف نے 'میری کہانی کی کہانی؛ میری زبانی' کے عنوان سے اپنی افسانہ نگاری پر مفصل لکھا ہے۔ اگرچہ انتظار حسین سے میں نے یہ سن رکھا ہے کہ لکھنے والا اپنی تخلیقات کے بارے میں جو کہے، اسے سن لینا چاہیے، اعتبار نہیں کرنا چاہیے، تاہم ناصر عباس نیر کی اس تحریر میں کئی ایسی باتیں ہیں جنھیں توجہ دی جانی چاہیے مثلاً وہ کہتے ہیں:

''میرے افسانوی کردار نقل کی نہیں تخیل کے اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ 'کہانی کا کوہ ندا' کے پروفیسر؛ 'خاک کی مہک' کے امام مسجد سے لے کر، 'ابا کا صندوق'؛ 'عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے، لاش کا نہیں'؛ 'درخت باتیں ہی نہیں کرتے'؛ 'تمھارا قانون'، 'خاموشی کا نئر'؛ 'میں کس سے پناہ مانگوں'؛ 'وہ آخری دن' کے مرکزی کرداروں تک، سب تخیلی، افسانوی کردار ہیں۔ ان پر کسی حقیقی شخص کا گمان ہو سکتا ہے، کوئی حقیقی شخص ان کی مانند گمان ویقین سے لے کر رنج و راحت بھی محسوس کر سکتا ہے، مگر وہ کسی حقیقی شخص کی ہوبہو نقل ہیں نہ اس کا متبادل ہیں۔ وہ افسانے کی دنیا کی مخلوق ہیں، وہیں پیدا ہوتے ہیں، وہیں سے سب دیکھتے، سنتے، سہتے، بھوگتے ہیں، وہیں مر جاتے ہیں یا وہیں اپنی موت کا انتظار کرتے ہیں، یا زندگی کے کسی ایک مقام پر رکے ہوتے ہیں، جہاں وہ موت کے منتظر ہوتے ہیں، نہ زندگی کے طلب گار۔''

ان کے مطابق:

''اس افسانوی مخلوق کے ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہیں، ہم زندہ انسانوں کے لیے ہیں۔ ہم ان کے سبب سے خود کو جانتے، پہچانتے ہیں۔ ان کے احساسات وتصورات اور ان کی شکست کی مدد سے اپنے احساسات وتصورات، اور ان کی شکست کے رنج ونجات کو سمجھتے ہیں، ان کے وجود کی حدوں کے اندر، اپنی حدوں کا تصور کرتے ہیں۔ یہ لسانی، خیالی، وضعی ہونے کے باوجود ہماری حقیقی زندگیوں میں حقیقی اثر کے حامل ہوتے ہیں۔''

میں سمجھتا ہوں کہ ناصر عباس نیئر کی یہ تحریر وہ دروازہ ہے جہاں سے ان کے فکشنی محل سرا میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ناصر کے افسانوں کا سب سے نمایاں وصف ان کا اسلوب ہے؛ یہ کردار جنھیں انھوں نے گنوایا ہے سب اسی اسلوب کی گٹھڑی میں بندھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بیانیے کا ایک ایسا انداز اختیار کیا ہے جو نہ خالص روایتی ہے اور نہ علامتی افسانے جیسا پیچیدہ۔ ان کے ہاں کہانی اپنی رفتار اور اپنے ڈھنگ سے آگے بڑھتی ہے یوں کہ خیال اسے ہانک رہا ہوتا ہے، بسا اوقات یہی خیال ایک متحرک کردار کی

حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ واقعات سے زیادہ کرداروں کے ذہن میں چلنے والی کشمکش کہانی کو آگے بڑھا رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں دانش اور تخیل ایک دوسرے کی ضد نہیں بل کہ ایک دوسرے کی تکمیل بن جاتے ہیں۔ ان کی زبان تہہ دار اور بامعنی ہے۔ وہ معمولی سے جملے میں بھی دوہری معنویت پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ماقبل متون کے اقتباسات، تاریخی حوالے، اساطیری اشارے خواب اور خواب جیسی کیفیت اور تہذیبی علامتیں محض علمی نمائش کے لیے بیانیے کا حصہ نہیں ہوتے، افسانے کی معنوی فضا کو وسیع کرنے کے وسیلے ہیں۔ یہ ایسا اسلوب ہے کہ قاری کو فکری سطح پر بھی کچوکے لگاتا اور اسے بھرپور ذہنی شرکت پر آمادہ کرتا ہے۔

ناصر کے افسانوں کے موضوعات بھی روایتی افسانہ نگاروں سے مختلف ہیں۔ انسانی وجود کی تنہائی، ذہنی اضطراب، شناخت کا بحران، یادداشت، خوف، گناہ کا احساس، طاقت اور جبر، تہذیبی زوال، آزادیِ فکر، زبان کا مسئلہ اور تاریخ کا بوجھ ان کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ خارجی واقعات سے زیادہ انسان کے باطن میں اترتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ اصل المیہ انسان کے اندر برپا ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں نفسیاتی پیچیدگیاں اس مہارت سے سامنے آتی ہیں کہ کرداروں کی ہر حرکت اور ہر فیصلہ ان کی داخلی کیفیت کا فطری نتیجہ محسوس ہوتا ہے۔ ''اپنے ماضی کا خدا'' میں احساسِ جرم اور محبت کے بدلتے ہوئے رویے ہوں، ''اپنا عصا اور اپنا اژدھا'' میں ذہنی الجھن اور وسوسوں کی کیفیت ہو، ''آوازیں اور سائے'' میں یادداشت اور تاریخ کا دباؤ ہو یا ''ورغلایا ہوا آدمی'' میں زبان اور شناخت کا مسئلہ، ہر جگہ انسان کی داخلی دنیا ہی افسانے کا اصل قضیہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے کئی افسانے اقتدار، قانون، سرحد، مذہب اور سماجی ڈھانچوں پر بھی سوال اٹھاتے ہیں مگر یہ سوال نعرے کی صورت میں نہیں بلکہ کہانی کے اندر سے ابھرتے ہیں، ایک اور طرح کی فضا بناتے ہوئے؛ اس لیے زیادہ اثر انگیز محسوس ہوتے ہیں۔

ناصر عباس نیر کی کردار نگاری بھی اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔ ان کے کردار عام افسانوں کی طرح صرف خارجی عمل کے ذریعے نہیں پہچانے جاتے بل کہ ان کی اصل شناخت ان کے ذہنی اور نفسیاتی وجود سے بنتی ہے۔ وہ کردار کے اندر اتر کر اس کی فکر، خوف، خواب، وسوسے، احساسِ جرم اور یادداشت کو اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ قاری اس کے باطن کا شریک ہو جاتا ہے۔ ان کے کردار اکثر کسی نہ کسی ذہنی یا

روحانی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں اور اسی کشمکش سے ان کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ میں کہہ آیا ہوں کہ ان کے یہاں کرداروں کی جسمانی حرکات سے زیادہ ان کی سوچ اہم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے کردار گویا اپنی "کیس ہسٹری" کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کردار اور خیال الگ الگ وجود نہیں رکھتے بل کہ ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ کردار سوچتے ہوئے بھی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور ان کی سوچ ہی افسانے کا واقعہ بن جاتی ہے۔ اس انداز نے ان کی کردار نگاری کو نفسیاتی گہرائی عطا کی ہے اور ان کے کردار مطالعے میں آنے کے بعد دیر تک قاری کے ذہن میں زندہ رہتے ہیں۔

ناصر عباس نیر کی افسانہ نگاری کی سب سے بڑی انفرادیت یہی ہے کہ انھوں نے تنقیدی شعور اور تخلیقی وجدان کے درمیان ایک کامیاب توازن قائم کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں فکر ضرور موجود ہے مگر وہ کہانی پر مسلط نہیں ہوتی بل کہ اس کے اندر تحلیل ہو جاتی ہے۔ انھوں نے تاریخ، فلسفے، اساطیر، نفسیات اور سماجی علوم سے استفادہ کیا مگر ان سب کو اپنے انداز کی افسانوی ساخت کا حصہ بنایا۔ ان کے یہاں قدیم اور جدید، حقیقت اور خواب، تاریخ اور حال، شعور اور لاشعور، سب ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ ایک نئی تخلیقی دنیا وجود میں آتی ہے۔ وہ قاری کو تیار شدہ نتائج نہیں دیتے بل کہ سوالات کے ذریعے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے محض تفریح یا وقتی تاثر پیدا نہیں کرتے بل کہ قاری کے ذہن میں دیر تک حرکت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاں خیال، علامت، تجرید، حقیقت اور قصہ ایک دوسرے کو کمک پہنچاتے رہتے ہیں کہیں اپنی الگ شناخت کے ساتھ اور کہیں امتزاجی قرینے سے بیانیے میں ڈھلتے ہوئے اور یہیں سے ناصر عباس نیر کے فکشن کی الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔

ناصر عباس نیر نے اردو افسانے کو نئی فکری وسعت، نئے اسلوب اور نئی معنویت عطا کی ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ افسانہ صرف واقعات بیان کرنے کا نام نہیں بلکہ انسانی وجود، تاریخ، تہذیب، زبان اور شعور کی پیچیدہ حقیقتوں کو دریافت کرنے کا ایک موثر وسیلہ بھی ہے۔ یہی وہ قرینہ ہے جس نے انھیں ایک الگ اسلوب کا اہم افسانہ نگار بنا دیا ہے؛ ایک ایسا افسانہ نگار جس کے ہاں اس صنف کا تخلیقی عمل، علمی وسعت اور فکری گہرائی کو فکشن کی چھب عطا کرنے کا نام ہے۔

☆☆☆☆☆

آصف ثاقب ___ اب کون تجھے پکارتا ہے

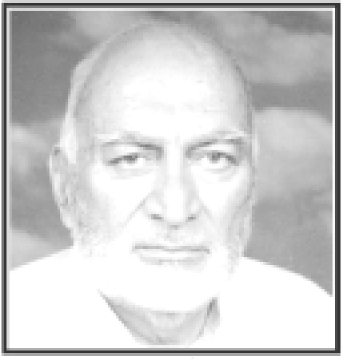

نہایت عمدہ اور نفیس لہجے کے شاعر، ادیب اور نقاد آصف ثاقب بھی پچھلے ماہ جولائی کے آخری ہفتے میں قیدِ حیات بندوغم سے ہمیشہ کے لیے نجات پا کر عالم بالا کو کوچ کر گئے۔

آصف ثاقب کا اس خورد سے تعلق پچھلے تین عشروں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ وہ پچھلے دو سال سے علیل تھے۔ ضعف اور نقاہت کا شکار تھے۔ وہ ایک دور افتادہ مقام بوئی کی ایک دیدہ زیب پہاڑی پر ایک وسیع اور کشادہ پرانی حویلی میں مقیم تھے۔ عموماً بعض احباب اور دوستوں کے ہمراہ ان سے ملاقات کے لیے جانا پڑتا تھا، بوئی کو جانے والی سڑک برسوں سے اعلیٰ حکام کی لاپرواہی اور بارشوں کی وجہ سے سفر کے قابل نہیں رہی، وہاں جانا خاصا کارِ دشوار ہے مگر ان کے ہاں آخر جانا ہی پڑتا تھا۔

دو سال پہلے اپنے بیٹے اور چند ادبی دوستوں کے ہمراہ بوئی میں ان کے کاشانہ پر حاضر ہوا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ایک چھڑی کے سہارے بڑی مشکل سے چلتے ہوئے مہمانوں کے کمرے میں آئے جہاں ہم بیٹھے ان سے ملنے کے منتظر تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر بے حد رنج ہوا وہ ہمارے سامنے بیٹھ گئے، انھیں کچھ کتابیں اور ادبی رسائل دیے وہ کچھ دیر ان کی ورق گردانی کرتے رہے، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا، خاصی باتیں کیں، پھر اپنا شعری مجموعہ ''اکتفا'' جو ان کے ہاتھ میں تھا کھول کر اپنا ایک شعر سنانے لگے:

ہارون الرشید

تمھارے سامنے اک بت کھڑا ہے
یہاں سے تو میں کب کا جا چکا ہوں

....

میں ان کے چہرے اور آنکھوں میں پھیلی ہوئی ویرانی کو بغور دیکھنے میں محو تھا- انھوں نے اپنا یہ شعر کوئی تین مرتبہ دہرایا- مجھے احساس ہوا کہ آصف ثاقب اب آخرت کے سفر پر جانے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر چکے ہیں-

انھوں نے اکتفا کے چند نسخے میرے ساتھ آئے ہوئے ہم سفروں میں تقسیم کیے- یہ زندہ اور خوش گو آصف ثاقب سے آخری ملاقات تھی- کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ان کے پاس بیٹھے رہے- کوشش بھی تھی کہ زیادہ سے زیادہ ان کی باتیں سنوں- برسوں سے ان کی قوت سماعت تقریباً ختم ہو چکی تھی- عموماً اس محرومی پر سخت رنجیدہ رہتے تھے کہ وہ محفل میں بیٹھے ہوئے دوستوں اور مہمانوں کی باتیں سننے سے بھی اب قاصر ہیں- اس کا دکھ ان کی شاعری میں کئی مقامات پر دیکھنے کو ملتا ہے:

ثاقب بس میں نہیں سماعت
اب کون تجھے پکارتا ہے

....

پچھلے سال گرمیوں کے دنوں میں ان کی بیماری کی اطلاع ملی- وہ مظفرآباد (آزاد کشمیر) کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھے- سخت تشویش لاحق ہوئی، مجھ سے رہا نہ گیا- اپنے دوستوں ادیب و ناول نگار رفیع شاکر عنقا اور شاعر سعید الرحمٰن کے ہمراہ انھیں دیکھنے گیا- اس وقت بستر پر لیٹے سو رہے تھے- میں ان کے پاس بیٹھ گیا، بیدار ہوئے تو میں نے سلام کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آب دیدہ ہو گئے- فوراً جیب سے آلۂ سماعت نکالا اور اس کی مدد سے مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگے- آہ! کوئی بات نہ کر پائے میں اندر سے کٹ کے رہ گیا- اسی اثنا میں ایبٹ آباد سے سلطان سکون کا فون آ گیا میں نے انھیں ان کی صحت و صورت حال سے آگاہ کیا وہ تفصیلات جان کر اداس ہو گئے-

آصف ثاقب سے گہرے تعلق میں خط و کتابت نے اہم کردار ادا کیا ہم ایک دوسرے کو باقاعدگی سے خط لکھتے تھے- انھیں میرے اور مجھے ان کے خطوط کا شدت سے انتظار رہتا تھا، میرے گھر میں الماریوں کے دراز اور فائلیں ان کے خطوط سے بھری پڑی ہیں- میں بعض اہم مسائل پر ان سے رہنمائی بھی حاصل کرتا تھا- علم و ادب تو ان کا اوڑھنا بچھونا تھا کوئی بھی موضوع ہو ہمیشہ مثبت اور صائب مشورہ دیتے تھے-

ان سے خط و کتابت کے دوران دو مرتبہ تعطل آیا، جس کا انھوں نے اثر لیا خود کوئی شکوہ نہیں کیا البتہ ان کی اہلیہ صاحبہ نے گلہ

بھی کیا اور ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ پھر چند برس پہلے بھی کچھ مصروفیات اور ذاتی پریشانی کی وجہ سے خط و کتابت جاری نہ رکھ سکا۔ اس بار انھوں نے میرے استاد پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کو کہا میں خط لکھنا ترک نہ کروں، یوں یہ سلسلہ پھر چل پڑا اور اس وقت بند ہوا جب ان کے ہاتھوں کی توانائی جواب دے گئی۔

آصف ثاقب مجھ پر بہت مہربان تھے اور مجھے اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔ ملتے تو ذاتی باتیں کر جاتے۔ جب میں کیڈٹ کالج بٹراسی سے وابستہ تھا تو ایبٹ آباد جاتے ہوئے ہمیشہ مجھے مل کر جاتے تھے۔ کالج کے پرنسپل کی خواہش پر میں نے ہر سال کالج میں مشاعرے، کا آغاز کیا تو وہ ہر مشاعرے میں باقاعدہ سے شرکت کرتے تھے۔ دوبار انھیں کالج میں مہمان سپیکر کے طور پر بھی مدعو کیا انھوں نے ان مواقع پر یادگار لیکچر دیے۔ ان کی اہلیہ صاحبہ بھی مجھے بہت عزت دیتی تھیں۔

انھوں نے زندگی بھر جم کر شاعری کی اور ادبی دنیا میں اپنا مقام بنایا۔ ان کی زندگی میں ان کے دو ہی شعری مجموعے "در کنار" اور "اکتفا" منظر عام پر آئے، اس کی کیا وجہ ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ایک بار کہنے لگے کوئی ڈیڑھ ہزار سے زیادہ غزلیں کہہ چکا ہوں۔

وہ نثر بھی نہایت اعلیٰ پائے کی لکھتے تھے، جس پر کلاسیکی رنگ کی گہری چھاپ ہوتی تھی۔ مضامین اور تنقید نپی تلی تحریر کرتے تھے زیادہ طویل مضامین نہیں لکھتے تھے۔ علم عروض پر دستگاہ رکھنے والوں میں وہ نمایاں مقام رکھتے تھے۔

ان کا کلام اور تنقیدی مضامین ملک کے تمام ادبی جرائد میں نمایاں طور پر شائع ہوتے تھے، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے متحرک لکھاری تھے۔

آصف ثاقب سچے کھرے مسلمان تھے۔ عشق رسولؐ ان کی نس نس میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کی نعتوں میں عشق نبی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ حج پر جانے کی بہت تڑپ رکھتے تھے لیکن حج ان کے نصیب میں نہیں تھا۔

آصف ثاقب کی شخصیت میں ایک عجیب کشش اور سحر تھا۔ جو ان سے ایک بار ملتا پھر بار بار ان کے ہاں جاتا۔ ان سے ملنے کے لیے دور دور سے لوگ یونہی ان کے گھر تک کھنچے چلے آتے تھے۔

مظفر آباد، مانسہرہ، ایبٹ آباد، ہری پور، راولپنڈی اور وزیر آباد سے آنے والے کئی ادیبوں اور شاعروں کو ان کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔

مجھے پچھلے تیس سال میں بار ہا ان کے پاس ہوئی جانے کے مواقع ملے۔ مظفر آباد سے ڈاکٹر افتخار مغل اور رشید اللہ فہیم کے ساتھ بھی دوبار

ان کے ہاں گیا۔ اب یہ دونوں بھی اس جہاں سے منہ موڑ چکے ہیں۔ آصف ثاقب کی خواہش پر ان کی شاعری پر دو مضامین لکھنے کا شرف ملا۔ خالد احمد کا اکثر اپنی گفتگو میں تذکرہ کرتے تھے۔ کہتے تھے خالد احمد مجھے ''بیاض'' میں لے آئے اور مجھے ہمیشہ عزت دی۔

2005 کے قیامت خیز زلزلے کے چند ماہ بعد وہ میرے ہاں ہزارہ آئے، دو دن میرے پاس قیام کیا۔ ایک دن رات کو کھانا کھانے کے بعد بستر پر دراز ہونے لگے تو کہنے لگے ''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب داڑھی رکھ لیں کیا آپ بھی ایسا کرنے کو تیار ہیں؟

میں نے فوراً حامی بھر لی۔ وہ اکثر خطوط میں لکھا کرتے ''داڑھی بڑھ رہی ہے'' میں خوشی کا اظہار کرتا اور لکھتا ادھر بھی آپ جیسا ہی حال ہے۔ کوئی آٹھ برس پہلے ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا، تو اس کے بعد ان کی روایتی بزلہ سنجی اور شوخی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک بار کہنے لگے۔ ''میری بیگم بہت مہربان اور کشادہ دل تھیں، میرے جیسے قوت سماعت سے محروم شخص کو برسوں برداشت کیا اور کبھی اُف تک نہیں کی۔''

ہزارہ یونیورسٹی میں پہلے ایم فل اور پھر پی ایچ ڈی کے تقریباً ایک دہائی کے سفر میں تین شخصیات کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی اور ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان نے قدم قدم پر جس طرح میری ہمت بڑھائی وہ الگ کہانی ہے۔ لیکن یہاں آصف ثاقب میں ان سے پیچھے نہیں رہے۔ ایم فل میں احمد ندیم قاسمی کی ادبی ادارتی نویسی، کے موضوع پر انتخاب انہی کی تجویز پر عمل میں لایا گیا اور اسے سب نے پسند کیا اور ان کے انتخاب کی تعریف کی۔

پی ایچ ڈی کے لیے بھی انھوں نے کوئی چھ موضوعات اپنے خط میں لکھ کر مجھے ارسال کیے تھے لیکن وہ زیادہ تر شاعری اور شاعروں کے متعلق تھے۔

جب کہ میں کسی افسانہ نگار کے افسانوں پر تحقیقی اور تنقیدی کام کی تلاش میں تھا۔

آصف ثاقب نے زندگی بھر فون پاس نہیں رکھا شاید اس کی انھیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لیے احباب اور دوستوں کو صرف خط لکھتے تھے، ان کی ادب سے وابستگی کی اہم شخصیات سے قلمی دوستی تھی دونوں میں ان سے رابطہ کٹ جانے کا ملال رہا لیکن ان تک رسائی بھی مشکل تھی۔

آصف ثاقب اس کارگہ شیشہ گری میں 91 برس جیئے بے داغ زندگی گزاری اور نہایت شان سے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ہوا میں غرق تو موجیں بھی سو گئیں ثاقب
وہ ایک شور مرے ڈوبنے سے پہلے تھا

☆☆☆☆☆

،،حبس زدہ ادبی ماحول میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا،،

سرگودھا ادبی حوالے سے اپنا ایک منفرد اور باوقار تشخص رکھتا ہے۔ یہ زرخیز خطہ مدتوں سے علم و ادب کی آبیاری کرتا آیا ہے اور اس کی مٹی نے کئی ایسی قد آور ادبی شخصیات کو جنم دیا جن کی شہرت ملکی سرحدوں کو عبور کر کے دنیائے ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہے۔

گزشتہ کئی دہائیوں سے سرگودھا میں یادگار ادبی تقریبات، مشاعروں، ادبی نشستوں اور علمی محافل کا ایک خوب صورت سلسلہ جاری رہا ہے، جس نے نہ صرف اس شہر کی ادبی شناخت کو مستحکم کیا بل کہ نسلِ نو کو بھی شعر و ادب سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مگر وقت کے ساتھ ساتھ ادبی منظرنامے میں بھی کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جنھوں نے اس خوب صورت روایت کو متاثر کیا۔ رفتہ رفتہ ذاتی تشہیر، نمود و نمائش اور اپنی ذات کو مرکزِ نگاہ بنانے کا شوق ادبی سرگرمیوں پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ نتیجتاً وہ محفلیں جن میں کبھی ادب، شعر، فکر اور تخلیق موضوعِ گفتگو ہوا کرتے تھے، وہاں شخصیات اور ان کی تشہیر زیادہ نمایاں ہونے لگی۔ اس صورتِ حال نے بالخصوص نسلِ نو کو ادبی تقریبات سے بددل اور متنفر کرنا شروع کر دیا۔ نوجوان جب ادب کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو وہ خلوص، محبت، رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے متلاشی ہوتے ہیں اگر انھیں وہاں گروہی مفادات، نمود و نمائش اور ذاتی مفاد نظر آئے تو ان کا بددل ہونا فطری امر ہے۔

مجھے دکھی دل کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ادبی حوالے سے موجودہ دور سرگودھا کے نوجوان شعرا اور ادبا کے لیے کسی حد تک گھٹن اور حبس زدہ ماحول کا آئینہ دار دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر افتخار فیصل کا وجود واقعی غنیمت ہے۔ وہ آج بھی ایسی ادبی

ارشد محمود ارشد

محافل سجاتے ہیں جہاں ذاتی تشہیر کا عنصر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی محافل میں ادب اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہوتا ہے، شاعر اپنی تخلیق کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے اور سامع کو محض سامع نہیں بل کہ محفل کا ایک باوقار حصہ سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر افتخار فیصل سے میرا کوئی بہت پرانا تعلق نہیں۔ مجھے سرگودھا کی ادبی محافل کا حصہ بنتے تقریباً بیس بائیس برس ہو چکے ہیں، لیکن اس طویل عرصے کے دوران کسی تقریب میں ان کا ذکر سننے یا انھیں نمایاں طور پر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ان سے میرا پہلا باقاعدہ تعارف تقریباً تین چار برس قبل کوئی کالج کے زیرِ اہتمام ہونے والی ایک ادبی نشست میں ہوا۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کی شخصیت نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی ایسے شخص سے ملا ہوں جس کے لیے ادب محض نام و نمود کا وسیلہ نہیں بل کہ محبت، خدمت اور خلوص کا نام ہے۔ بے لوث محبت اور بے غرض خلوص جیسے ان کی رگ رگ میں رچا بسا ہے۔

ڈاکٹر افتخار فیصل کے زیرِ انتظام ہونے والی ادبی تقریبات میں ان کے بارے میں ہونے والے اظہارِ خیال اور مختلف ادبی دوستوں سے ان کے بارے میں استفسار کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بظاہر درویش صفت نظر آنے والی ہستی اپنے اندر کیسے کیسے جواہر چھپائے بیٹھی ہے۔ تاہم میں اس بات سے قطعی لاعلم ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے اب تک اپنی کوئی کتاب شائع کیوں نہیں کروائی۔ میں نے کئی مرتبہ ”پذیرائی“ کے سلسلے میں ان سے تعارف اور کلام کی درخواست کی، مگر انھوں نے ہمیشہ بڑے پیار اور محبت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ارشد، مجھ سے بہت سے لوگوں نے تعارف اور کلام مانگا، لیکن میں نے کبھی کسی کو نہیں دیا۔ اب اگر تمھیں دوں تو بہت سے دوست ناراض ہو جائیں گے۔

یہ جملہ بظاہر بہت سادہ ہے، مگر اس کے اندر ڈاکٹر افتخار فیصل کی شخصیت کا ایک پورا جہان آباد ہے۔ آج کے عہد میں جب ہر شخص اپنی ذات کو نمایاں کرنے، اپنے نام کو آگے بڑھانے اور اپنی موجودگی کا اعلان کرنے کے لیے بے تاب دکھائی دیتا ہے، وہاں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جو اپنی ذات کو پس منظر میں رکھ کر دوسروں کو سامنے لانے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ یہی وصف انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔

ڈاکٹر افتخار فیصل کے ادبی قد و قامت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ موجودہ ادبی منظرنامے کی کئی مہان شخصیات، جن میں ڈاکٹر وحید احمد، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، ڈاکٹر ثاقب ندیم اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے نام شامل ہیں، ان کی ادبی کیاری میں پروان چڑھنے والے پودے تھے جو آج تناور شجر کا روپ دھار چکے ہیں۔ اس کے باوجود ان شخصیات کے دل میں ڈاکٹر افتخار فیصل کے لیے آج بھی جس

احترام، محبت اور عقیدت کا جذبہ موجود ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کسی کی تربیت، سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے بعد اسے کامیابی کی بلندیوں پر دیکھ کر خوش ہونا ایک بڑے دل کی علامت ہے، اور ڈاکٹر افتخار فیصل کے ہاں یہی کشادہ دلی نمایاں نظر آتی ہے۔

جو لوگ ڈاکٹر افتخار فیصل کی شخصیت سے واقف ہیں، ان کے لیے یہ درویش صفت انسان کسی پیر و مرشد سے کسی طور کم نہیں۔ جناب مقصود وفا نے شاید اسی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا "پاکستان بھر میں مشاعرے پڑھے، مگر ڈاکٹر افتخار فیصل کی دعوت پر جب بھی سرگودھا آنا ہوا تو یہی احساس ہوا جیسے کسی درگاہ پہ حاضری کے لیے جا رہے ہوں۔ یہ محض ایک جملہ نہیں بل کہ ڈاکٹر افتخار فیصل کی شخصیت کے لیے ایک بھرپور خراجِ تحسین ہے۔

میں نے گزشتہ تین چار برسوں کے دوران ڈاکٹر افتخار فیصل کی جتنی بھی ادبی تقریبات میں شرکت کی، ہر بار ایک الگ طرح کا سکون، اطمینان اور اپنائیت محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کبھی سرسری سی دعوت دے کر مطمئن نہیں ہوتے۔ اگر پندرہ دن بعد کوئی تقریب رکھی ہو تو اس دوران کم از کم تین مرتبہ یاد دہانی ضرور کرائیں گے کہ آپ نے لازماً آنا ہے۔ ان کے ہاں دعوت محض رسمی نہیں ہوتی بل کہ اس میں ایک ایسا خلوص شامل ہوتا ہے جو سامنے والے کو خود کو اہم محسوس کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

تقریب والے دن ان کا اندازِ میزبانی بھی اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ سینئر ہو یا جونیئر، شاعر ہو یا نثر نگار، معروف ہو یا نوآموز، وہ سب کا استقبال ایسے کرتے ہیں جیسے ہر شخص تقریب کا مہمانِ خصوصی ہو۔ وہ خود کبھی سٹیج پر براجمان ہونے کی خواہش نہیں رکھتے۔ اگر کوئی مہمان تصویر بنوانے کی غرض سے انھیں زبردستی سٹیج پر بٹھا بھی لے تو دو منٹ بعد واپس عام سامعین کے درمیان آ بیٹھتے ہیں اور پھر ہر اچھے شعر پر دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ ان کی خوشی کسی دوسرے کے اچھے شعر، اچھی بات اور اچھی تخلیق میں شامل ہونے سے وابستہ ہے۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں بعض سینئرز کا رویہ انتہائی مایوس کن دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے ادبی قد و قامت کی فکر میں ہلکان رہتے ہیں۔ کبھی کسی تقریب میں اسٹیج پر جگہ میسر نہ آنے پر مہینوں چہرے پر خفگی لیے پھرتے ہیں، اور کبھی اس بات پر شاکی رہتے ہیں کہ انھیں حسبِ منشا پروٹوکول کیوں نہیں دیا گیا۔ بعض اوقات تو جن کے پلے چار غزلیں بھی قابلِ ذکر نہیں ہوتیں، انھیں بھی اپنی "سینئرٹی" کی فکر راتوں کو سونے نہیں دیتی اور وہ خود ساختہ عظمت کے پہاڑ سے نیچے اترنے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہ رویے یقیناً ادب کی خدمت نہیں بل کہ اپنی ذات

کی خدمت کے مترادف ہیں۔
یہی رویوں کا فرق ہے جو کسی شخص کی عزت و توقیر میں اضافہ کرتا ہے۔ خلوص اور محبت تقسیم کرنے سے کبھی کم نہیں ہوتے، بل کہ بڑھتے ہیں۔ کسی دوسرے کو آگے بڑھانے سے اپنا قد چھوٹا نہیں ہوتا، بل کہ انسان کے کردار کا قد بلند ہوتا ہے۔ ادب بھی آخرکار انسانوں کے درمیان محبت، احترام، برداشت اور حسنِ سلوک کا نام ہے۔ جو شخص دوسروں کے لیے جگہ بناتا ہے، وقت آنے پر لوگ اس کے لیے اپنے دل میں جگہ بناتے ہیں۔
ڈاکٹر افتخار فیصل کی سب سے بڑی خوبی شاید یہی ہے کہ انھوں نے ادب کو اپنی ذات کی تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا بل کہ اسے دوسروں کے لیے ایک وسیلۂ محبت بنا دیا ہے۔ وہ محفل سجاتے ہیں تو خود محفل کا مرکز بننے کے بجائے دوسروں کو مرکز بناتے ہیں۔ وہ شعر سنتے ہیں تو شاعر کے نام سے زیادہ شعر کی قدر کرتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں اپنے ماضی کی جھلک نہیں بلکہ مستقبل کی امید تلاش کرتے ہیں۔ یہی وہ رویہ ہے جو کسی بھی ادبی معاشرے کو زندہ رکھتا ہے۔
ایسے لوگ کسی بھی شہر کے ادبی سرمائے کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کی قدر محض اس لیے نہیں ہونی چاہیے کہ انھوں نے کتنی کتابیں لکھیں یا کتنے مشاعرے پڑھے، بل کہ اس لیے بھی کہ انھوں نے کتنے لوگوں کو لکھنے، پڑھنے، کہنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ کسی شاعر کی ایک کتاب سے زیادہ قیمتی کبھی کبھی وہ اعتماد ہوتا ہے جو ایک استاد یا بزرگ کسی نوجوان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے۔
سرگودھا کی ادبی تاریخ نے بہت سے نام دیکھے ہیں اور یقیناً آنے والے وقت میں بھی اس شہر سے کئی بڑے شاعر، ادیب اور دانشور سامنے آئیں گے۔ لیکن ان ناموں کے پیچھے جن لوگوں کی خاموش محنت، بے غرض محبت اور مسلسل سرپرستی شامل ہوگی، ان میں ڈاکٹر افتخار فیصل کا نام یقیناً احترام سے لیا جائے گا۔ شاید یہی کسی ادبی شخصیت کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ اس کا نام اپنی ذات سے زیادہ ان لوگوں کے ذریعے زندہ رہے جنھیں اس نے سنوارا، سراہا اور آگے بڑھایا۔
میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر افتخار فیصل کو صحت و عافیت والی طویل زندگی عطا فرمائے، ان کے خلوص کو قائم و دائم رکھے اور انھیں اسی طرح سرگودھا کی ادبی فضاؤں کو اپنی محبت، شفقت اور ادب دوستی سے معطر کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دعا ہے کہ ان کی محفلیں اسی طرح نوجوانوں کے لیے امید کا چراغ بنی رہیں، شعرا و ادبا کے لیے حوصلے کا وسیلہ بنیں اور سرگودھا کی ادبی روایت کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی رہیں۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

نثار ترابی ــــ میرے آسمانِ ذات کا ایک روشن ستارہ

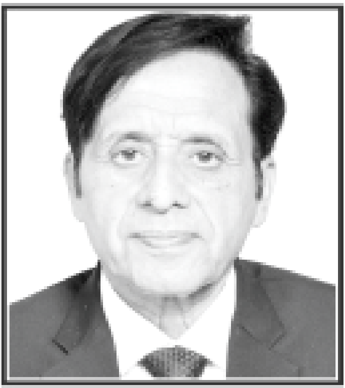

میرا نثار ترابی صاحب سے تعارف آج سے تقریباً اڑتیس سال قبل، یعنی انیس سو چھیاسی کے قریب، اُس وقت ہوا جب میں نے ایلیٹ ہائی سکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ غالباً ترابی صاحب نے اس کے ایک برس بعد، یعنی انیس سو ستاسی میں، جب میں ساتویں جماعت میں پہنچا تو ہمیں اردو پڑھانا شروع کیا۔ اگر آپ مجھے اپنے منہ میاں مٹھو بننے والا طعنہ نہ دیں تو میں عرض کروں کہ میں ایک لائق فائق طالبِ علم تھا ــــ اس حد تک کہ پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کبھی کسی امتحان میں دوسرے نمبر پر نہیں آیا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے اسکول کے تقریباً تمام مضامین کے اساتذہ کے پسندیدہ طالبِ علموں میں سے ایک ہوتا تھا۔ یہ تمہید اس لیے ضروری ہے کہ آپ کو اس احترام اور قدر و قیمت کے احساس کا اندازہ ہو سکے جو میرے دل میں ترابی صاحب کے لیے ہے۔

تو میں بیان کر رہا تھا کہ میں چونکہ اپنی جماعت میں اوّل آنے والا طالبِ علم تھا اور ہمیشہ جماعت کے مرکزی، پہلے بینچ ہی پر بیٹھا کرتا تھا، اس لیے تمام اساتذہ کی نظروں میں رہتا تھا اور تقریباً تمام اساتذہ ہی سے ایک استاد ـ شاگرد کے تعلق کے ساتھ ساتھ ایک ذاتی سا تعلق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ تمام اساتذہ آج بھی مجھے اپنے آبا و اجداد کی طرح یاد ہیں، اور اُن سب کا مجھ پر کسی نہ کسی حوالے سے احسان موجود ہے۔

لیکن دو ایسے اساتذہ جنھوں نے میری زندگی پر ــــ میری زندگی کو بدلنے والے ــــ اثرات ڈالے، ان میں سے ایک تو راجہ نصیب خان صاحب تھے جو میرے انگریزی کے استاد تھے، اور دوسرے نثار ترابی صاحب جو ہمیں اردو

علی ارمان

پڑھایا کرتے تھے۔
نثار ترابی صاحب میرے لیے محبت، محنت اور مروّت کے استعارے، اور میرے آسمانِ ذات کے ایک روشن ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔
آج چونکہ تفصیل کا موقع محل نہیں اور دامنِ وقت اتنا کشادہ نہیں کہ ہم اس کو پکڑ کر ماضی کے مضافات کی سیر کی ضد کر سکیں، اس لیے اپنی بات کو مختصر رکھتے ہوئے اتنا ہی کہوں گا کہ آج جب میں خود کو بغور اور ایمانداری کے ساتھ دیکھتا ہوں تو میرے باغِ وجود کے جتنے ذاتی، تخلیقی اور حتیٰ کہ عقیدائی غنچہ ہائے گوناگوں چٹک کر پھول بنے یا بننے کی تیاری میں ہیں، تو تقریباً ان سب کی اس مہکتی کشود میں استاد محترم جناب ترابی صاحب کی بخشی ہوئی نمو میں بہت بڑا اور ابتدائی حصہ ہے۔
میں ابھی اپنے کچھ بوڑھا ہونے کا منتظر ہوں تاکہ میں اپنی یادداشتیں یا آپ بیتی لکھ سکوں۔ اس میں میرے بیالوجیکل وجود کے پہلے باب کے بعد جب میرے تخلیقی وجود کا حصہ شروع ہوگا تو یقیناً نثار ترابی صاحب اس کا بابِ اوّل ہوں گے۔
مختصراً یہ کہ میں نے اپنی ذاتی اور تخلیقی زندگی میں محنت، محبت اور مروّت کی جتنی قدریں سیکھی ہیں، وہ میرے والدین اور میرے خاندانی بزرگوں کے بعد سب سے زیادہ جس شخص اور استاد کی مرہونِ منت ہیں، وہ آج آپ کے سامنے اس محفل کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں۔ میرے لیے آج ایک خوش بخت دن ہے کہ آج سات سمندر پار میں اس تقریب کا حصہ ہوں جس میں ترابی صاحب کا اعتراف بطور ایک شاعر، تخلیق کار، محقق، تنقید نگار اور استاد کے کیا جا رہا ہے۔
میں نے ترابی صاحب کے حوالے سے کسی حد تک ذاتی بات کی کیونکہ میرے خیال میں یہ ضروری تھی۔ اُن کی تعلیمی، ادبی اور تخلیقی اچیومنٹس کیا ہیں، وہ تو آپ کو ہر جگہ دستیاب ہو جائیں گی، اور پاکستان میں ایسے شاعر، ادیب، تخلیق کار اور ثقافتی شخصیات کم کم ہیں جن کا سی وی بنایا جائے تو اس کے لیے دو چار صفحات نہیں، ایک پمفلٹ یا چھوٹی سی کتاب کی ضرورت پڑتی ہے۔
دنیا میں آپ سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن اپنے والدین اور اپنے اساتذہ کا قرض کبھی بھی نہیں اتار سکتے۔ ایسے ہی ہے جیسے درخت کہ جب وہ تنومند اور مضبوط ہو کر زمین پر جم جاتے ہیں تو طوفانوں سے خود لڑ سکتے ہیں؛ لیکن جب وہ بیج سے پھوٹ کر ایک ننھی سی کونپل کی صورت میں ہوتے ہیں تو انہیں ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی اکھاڑ کے پھینک سکتا ہے۔ تو جن ہتھیلیوں نے ان کے گرد حلقہ کر کے انہیں ہوا سے بچایا ہوتا ہے وہ ہتھیلیاں انہیں کبھی نہیں بھولتیں اور نہ بھولنی چاہئیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو ان درختوں پر پھر پھل نہیں لگتے، اور لگ بھی جائیں تو کڑوے ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

کہتے ہیں جسے شاعری

شاعری جیسی نعمتِ خداوندی ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی- اس میں الگ جہان کی تخلیق اس سے بھی سوا نعمت ہے کہ یہ بھی معدودے چند لوگوں ہی کو میسر آتی ہے آپ شعر کہیں اور کوئی دوسرا یہ کہہ دے کہ یہ شعر فلاں شاعر کا ہے تو آپ معروف، ممتاز اور عظیم شعرا کی درجہ بندی سے بے نیاز ہو کر، ایک ایسے منصب پر فائز ہو جاتے ہیں جس کی تمنا ہر سخنور کرتا ہے جلیل عالی بھی ایک ایسے ہی جدا، منفرد اسلوب کے حامل اور صاحب توفیق شاعر ہیں جنھوں نے شاعری میں اپنا الگ جہان تخلیق کیا ہے، جن کا شعر پڑھ کر پوچھنا نہیں پڑتا اور جو ممتاز اور عظیم شعرا کی درجہ بندی سے الگ ایک مقام خاص پر فائز ہیں جہاں نہ چاہتے ہوئے بھی، نہ چاہنے والوں کی نظر بھی پڑتی ہے اور رشک کرتی ہے-

جلیل عالی ایک شاعر، نقاد، ماہر تعلیم، سوشیالوجسٹ، اقبال شناس، وطن پرست اور عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں ان کی کثیر الجہتی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر بات کی جا سکتی ہے مگر مجھے گفتگو کا فن نہیں آتا دیگر اہلِ علم یقیناً گفتگو کریں گے- یوں بھی ایسی کوئی بات کہنے سے ڈرتا ہوں جو ان کے شایانِ شان نہ ہو اس سارے معاملے میں ان سے بے پناہ محبت، عقیدت اور احترام کا رشتہ بھی ہے-

شاعری میں شعر اور معنی کی جستجو اصل میں شاعر کی شخصیت کی تلاش کا عمل ہے کیونکہ کسی بھی شاعر کی شاعری خزانے کا نقشہ و کلید ہوتی ہے اگر توجہ سے اس میں موجود خاص نشانات اور راستوں کا استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو یقیناً اس خزانے تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جو شاعر نے ہر نادیدہ و نابینا کی دسترس سے دور رکھا ہوتا ہے جلیل عالی کی کتاب ”آگے ہمارا خواب ہے“ بھی ایک خزانے کا نقشہ ہے جہاں ایک سے ایک نادر جوہر موجود ہے مگر وہاں تک رسائی کے لیے متجسس نگاہ، موجود سے پرے دیکھنے کی صلاحیت، لہو میں جنوں اور دل میں تڑپ کا ہونا

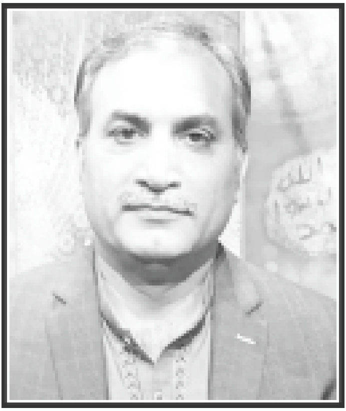

سعید راجہ

ضروری ہے:

ازل سے بے کراں ہونے کے سودائی ہیں عالی
حدِ امکاں سے بھی آگے ہمارا خوابیہ ہے

....

بے کراں ہونے کا سودا سر میں نہ سمائے تو سب بے کار ٹھہرتا ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر خواب کی وسعت اور منزل حدِ امکان سے پرے طے کی جاتی ہے جلیل عالی کا خوابیہ حدِ امکان سے آگے ہے جو ان کی فکر میں عشق اور جنون کی موجودگی کا برملا اعلان ہے یہ وصف جہاں مسلسل ریاضت، لگن اور جستجو کا متقاضی ہے وہیں جلیل عالی جیسے مردِ دانا کو خدائے بزرگ و برتر پہ کامل یقین اور رسولِ رحمتؐ کی محبت سے جوڑتا ہے اللہ رب العزت سے ان کا تعلق دیکھیے:

دھرا ہے وقت کی دہلیز پر سارا اثاثہ
وہ جانے کب کوئی داغِ قبا مہتاب کر دے

اسی دھن میں کٹی ہے زندگی، وہ صاحبِ کن
سخن کوئی ہمارا بھی دُرِ نایاب کر دے

....

یہ اسی یقین اور دُھن کی برکت ہے کہ ان کا سخن دُرِ نایاب ٹھہرا ہے رسولِ رحمتؐ سے محبت دیکھیے

....

اک نور جس کے سائے میں چلتی رہی حیات
اک اسمؐ جس کے ہم کو سدا آسرے رہے

اس میرِؐ دو جہاں کا ہے فیضاں کہ اپنے دل
کھوٹی رُتوں کے بیچ بھی عالی کھرے رہے

یہ شعر پڑھا تو اک تجسس ختم ہوا کہ غیر یقینی صورتِ حال اور ابتر حالات کے باوجود جلیل عالی کیسے اپنی فکر اور نظریے پر ڈٹے رہتے ہیں کھلا کہ یہ سب کس کا فیضان ہے۔

"آگے ہمارا خوابیہ ہے" کے سفر میں احساس ہوتا ہے کہ شاعر صاحبِ نظر ہے وقت کی نبض شناسی کا فن اس سے بہتر کسی کو نہیں آتا اسے خبر ہے کہ حالات کے رُخ کا بھید بستی کے اہلِ خبر پر بھی نہیں کھل رہا، وہ جانتا ہے کہ ہر سُو اتنا غبار اڑا دیا گیا ہے کہ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کھوٹا کیا ہے، کھرا کیا ہے، در کہاں ہے اور دیوار کہاں وہ سرِ شعور مسلسل چراغ جلائے رکھتا ہے اور اس کے لہو میں اضطراب کا رقص جاری رہتا ہے اسی لیے تو کہتا ہے:

برسوں نہ کسی کو سمجھ آئے گی کہانی
اس بار ہوا ایسی جگائے گی کہانی

رہ جائیں گی حیران زمانے کی نگاہیں
یوں راہ کی دیوار ہٹائے گی کہانی

کچھ روز کے بعد ایک جدا موڑ مڑے گی
رستے نئے دنیا کو بھجائے گی کہانی

دیکھو گے کہ لکھی ہوئی جن کی ہے، انھیں بھی
اب اپنے اشاروں پہ چلائے گی کہانی

....

شاعر نے برسوں پہلے اپنی فکری اور شعوری کائنات میں رہتے ہوئے مستقبل میں جھانکا اور

موجودہ وقت کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور نظم کر دیا میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ نظر اس شعر پر پڑی:

جنوں کی دھج کے زمانے کدھر گئے عالی
کوئی خوشی سے سرِ دار کیوں نہیں جاتا

....

یہ سوال اب کون پوچھتا ہے؟ مصلحت پسند زمانے میں یہ سوال صاحبِ نظر ہی پوچھ سکتا ہے آگے اک اور شعر نے روک لیا:

میں مانتا ہوں فقط صاحبِ شعور اس کو
جو جانتا ہے جنوں اب بھی کتنے کام کا ہے

....

کیسا نادر جوہر ہاتھ لگا صاحبِ شعور کا صاحبِ جنوں ہونا ضروری ہے یعنی صاحبِ جنوں صاحبِ شعور ہوتا ہے شعور کا ہونا جنوں کے وجود سے مشروط ہے جنوں اور شعور لازم و ملزوم ہوتے ہیں یہی سوچتے ہوئے مرے سامنے کتنے ہی نام ابھرنے لگے حسین ابنِ علی، سقراط، منصور حلاج، رومی، اقبال اور بہت سے نام مگر جستجو ھل من مزید کا تقاضا کرتی ہے، سو میں نے سفر آگے کی طرف جاری رکھا بہت سے اشعار نے روکا، اپنی سمت متوجہ کیا مگر مجھے شاید کسی خاص چیز کی تلاش تھی اور پھر وہ مجھے مل گئی:

وہ جو آپ اپنا ہم نوا ہو، اسے
وقت دیر تک گنگناتا ہے

....

ہاتھوں کی کمائی کی توانائی سلامت
آنکھ اپنی کسی اور کے دانے پہ نہیں ہے

جھیل جاتے ہیں خطا اپنی سمجھ کر ہر زخم
ہم سے الزام کسی پر دھرا جاتا نہیں ہے

....

جلیل عالی کی ذات نمایاں ہونے لگی تجسس بڑھنے لگا میں نے بھی صفحات پلٹنے کی رفتار بڑھا دی:

اس فرق کا اندوہ تو جینے نہیں دیتا
دنیا سے بہت ہم نے لیا اور دیا کم

....

ہمیں فرصت نہیں تھی کہ پوچھیں حال اس کا
کوئی اندر کسی کونے میں پیہم رو رہا ہے

....

من عرف نفسہ نے سرگوشی کی ایک اور نادر جوہر ہاتھ لگ گیا __ اپنی ذات کا عرفان جسے یہ عرفان ملا وہ کامیاب ہو گیا اسے زندگی کی کلید مل گئی اس نے حقیقت کو پا لیا- جو خود شناس ہوا اسے خدا شناسی کا شرف بھی مل گیا-

میری جستجو کو مہمیز ملی میں کسی نئی سمت جانا چاہتا تھا سو چل پڑا ___ ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات موجود تھی کہ جلیل عالی گفتگو کے آدمی ہیں- وہ مکالمہ پسند کرتے ہیں- ساری عمر مکالمے میں گزار دی ہے- اس وصف کی جھلک بھی کہیں ہو گی- اور پھر میری نظر اس مصرع پر پڑی:

اوروں سے گفتگو میں گزاری ہے زندگی

....

تسلی ہوئی کہ اب کچھ نہ کچھ مل جائے گا __ مکالمہ ایک صحت مندانہ رویہ ہے جو مسائل کے حل میں مثبت کردار ادا کرتا ہے- برداشت اور رواداری کو فروغ دیتا ہے- دلوں کو جوڑتا

ہے اور ایک ایسی فضا قائم کرتا ہے جہاں محبت اور امن پنپتے ہیں ___ اس تلاش میں میری نظر ان اشعار پر پڑی:

ہم سے نہیں ہیں آپ اگر متفق نہ ہوں
لہجہ مکالمے میں پر اتنا بھی سرد کیا

....

مکالمت سے ہی محروم ہو کے رہ جائیں
دل و نظر میں نہ اتنا بھی فاصلہ ٹھہرے

اور پھر یہ بھی کہ:

مکالمہ وہاں ممکن کہاں، جہاں عالی
ہو اپنی اپنی انا کا اسیر ہر کوئی

....

ایک اور قیمتی شے ہاتھ لگی انا کی اسیری کوئی مثبت کام نہیں ہونے دیتی اگر کامیاب کی سمت بڑھنا ہے تو انا کی اسیری سے بچنا ہوگا۔

سچ کہوں تو ''آگے ہمارا خواب ہے'' ایک بصیرت اور بصارت رکھنے والے شخص کی فکر میں موجود نادر اور اصول دانش اور خیالات کا خزانہ ہے میں نے اس خزانے سے بہت کچھ اپنے دامن میں بھرا ہے آپ بھی کوشش کیجیے مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اپنا دامن بھر لیں گے اور اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

آپ کیلئے کچھ جستہ جستہ نوادرات کی جھلک:

اک لو لہو میں شوقِ شہادت کی تھی سو ہم
مقتل میں آپ آئے ہیں لائے نہیں گئے

....

چراغ کون جلائے اگر سب اہلِ نظر
اس انتظار میں بیٹھے رہیں، ہوا ٹھہرے

زباں پر کیوں نہیں لاتے کبھی حرفِ محبت
یہ برگِ گل ہے یارا کوئی انگارا نہیں ہے

....

جس رنگ کہا دل نے اسی ڈھنگ جئے ہیں
دنیا کی شرائط پہ بِتائی نہیں دنیا

....

بے برکت اظہار اسی کو کہتے ہیں
لفظ الجھنے لگ جاتے ہیں معانی سے

....

منہدم شہر تو کر سکتے ہیں لیکن عالی
خواب ڈھانے کی سکت آتش و آہن میں نہیں

....

مرا لکھا ہوا خلوت میں پڑھ، یہ خواب نامہ
بجھائے ہوؤں کو کاروانے جا رہا ہے

....

خلقتِ شہر کو وعدوں کے افق پر عالی
کون سا خواب ہے ایسا جو دکھایا نہ گیا

....

آسماں دسترس میں ہیں لیکن
اپنی ترجیح اپنی دھرتی ہے

....

عالی کرم تمام اُسی شاہِ کُن کا ہے
پیری میں بھی قلم کو نقاہت نہیں ہوئی

....

کہتے ہیں اسے شاعری، پڑھ کر کے جسے کوئی
ہوتا ہے جس انداز کا ویسا نہیں رہتا

....

مجھے یقین ہے کہ آپ سب کے انداز میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور رونما ہوئی ہوگی۔

دعا ہے کہ ربِّ کائنات ان کی توقیر اور توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

انوار انجم کا مختصر شعری سفر

انوار انجم کا شعری مجموعہ ''شاخِ نہالِ غم'' پہلی بار 1973 میں اردو اکادمی ملتان نے شائع کیا تھا۔ 27 برس گزر جانے کے باوجود اس مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا باوجوہ ممکن نہ ہو سکا، حالانکہ انوار انجم کا کلام اور اس کا شعری مقام یہ تقاضا کرتا تھا کہ اسے بار بار شائع کیا جاتا تاکہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے رہنما روشنی کا کردار ادا کر سکتا۔

انوار انجم نے اپنے خاندان کی کفالت اور ترقی کے لیے جو قربانیاں دی تھیں وہ تقاضا کرتی تھیں کہ ان کے بہن بھائیوں میں سے کوئی اس کا قرض چکا دیتا۔ دیر بعد سہی اسکے چھوٹے بھائی اقبال ظہیر تاشی نے اس ذمہ داری کا احساس کیا اور نہ صرف انوار انجم کے شعری مجموعہ کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا اہتمام کیا بلکہ اُس مقالہ Thesis کی اشاعت کا بھی حوصلہ کیا جو انوار انجم نے ایم اے اُردو کے دوران ''میرا جی'' پر تحریر کیا تھا۔ اس مقالہ کے خوشہ چینوں نے کسی حوالہ کے بغیر ان کے مقالہ سے استفادہ کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔

اقبال ظہیر تاشی جب بھی مختصر عرصہ کے لیے ہی سہی امریکہ سے پاکستان آتے تو انوار انجم کے شعری مجموعہ اور میرا جی پر ان کے مقالہ کی اشاعت کی خواہش کا اظہار کرتے لیکن پاکستان کے اشاعتی اداروں کے کمرشلزم سے مایوس ہو کر لوٹ جاتے۔ اس سال وہ پاکستان آئے تو ایک عزمِ صمیم کے ساتھ تھے لیکن اشاعتی اداروں کے ادب دشمن رویوں سے گھبرا کر یہ کام میرے سپرد کر گئے۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی اور میں خود کو اسکا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ اس کارِ خیر میں منور جمیل اور

فیاض تحسین

سید آصف جاہ نے میری مدد کی۔ الحمد پبلی کیشنز کے صفدر حسین نے یہ ذمہ داری قبول کی اور اپنی ادب دوستی کی روایت کو قائم رکھا۔ میں ان سب کا ممنون ہوں کہ ان کے تعاون نے مجھے سرخرو ہونے کا موقع فراہم کیا۔ انوار انجم کی بہن گلفشاں اور بہنوئی محمد نصیر ہمایوں نے بھی اس مجموعہ کی اشاعت میں دلچسپی لی۔

میں پروفیسر شوذب کاظمی کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے مسودہ کی تطہیر و تہذیب میں مدد کی اور عروضی معاملات کا جائزہ لیا۔

انوار انجم ابھی 26 سال کے تھے کہ اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ اس مختصر سی عمر میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ شعری ادب کی تخلیق میں مصروف نوجوان نسل کے لیے ایک معیار مقرر کرتا ہے۔ انوار انجم اردو شاعری کی کلاسیکی روایت اور جدید اردو شاعری کے سنگم پر کھڑا میر تقی میر کی روایت کے آخری شاعر ناصر کاظمی کا دوست بھی تھا اور جدید اردو نظم کی مضبوط آوازوں میرا جی اور ن۔م۔راشد کا ہمعصر بھی۔

روایت اور جدیدیت کا ایک خوبصورت امتزاج انوار انجم کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ وہ بالآخر روایت کا اسیر ہوتا یا جدیدیت کا، یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر روایت سے رشتہ قائم رکھتا تو ناصر کاظمی کا ہم پلہ ہوتا اور اگر جدیدیت کی طرف راغب ہوتا تو مجید امجد کی سطح کا شاعر۔ لیکن افسوس عمر نے اسے یہ موقع ہی نہ دیا۔ انوار انجم کی شاعری کا تفصیلی جائزہ محترم عرش صدیقی نے تحریر کیا تھا جسے پہلے ایڈیشن کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ ان کا یہ مضمون اس ایڈیشن میں بھی شامل رکھا گیا ہے۔ محترم عرش صدیقی اب خود بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔ انوار انجم کے ساتھ عرش صدیقی کی محبت کا اندازہ اس عرق ریزی سے ہو سکتا ہے جو اس تجزیہ میں شامل ہے۔

انوار انجم نے آخری سانس میری گود میں لیا تھا۔ وہ لمحہ میرے وجود میں اس طرح سرایت کر گیا کہ میری ذات کا حصہ بن گیا۔ لگتا ہے اس کی روشن اور متحیر آنکھیں آج بھی مجھے دیکھ رہی ہیں اور زمانہ کی ناقدری کا گلہ کر رہی ہیں۔ انوار انجم نے اپنی ایک نظم ''مگر ایک شاخ نہال غم''

اپنی موت سے چند روز پیشتر 1969 میں کہی تھی۔ ان کی رحلت کے کچھ ہی عرصہ باد میں نے ایک نظم بعنوان ''خواہشوں کا کسیلا پھل'' لکھی جو 1973 کے ''فنون'' میں شائع ہوئی تھی اور میرے شعری مجموعہ ''رزق ہوا'' میں شامل ہے۔ اس مجموعہ کے فلیپ پر یہ نظم بھی تحریر ہے کہ یہ انوار انجم کا مرثیہ ہے۔ ان دونوں نظموں کے بطون میں جھانکنے سے انوار انجم کی ذات اور اس کے شعری اظہار کا احاطہ ممکن ہے۔

مجھے امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت سے انوار انجم کا شعری ویژن نئے لکھنے والوں پر وا ہو گا۔

اور ادبی نقادوں کی توجہ حاصل کرے گا۔

☆☆☆☆☆

خاموشی سنانے کا فن:

ڈاکٹر سعادت سعید کے مجموعہ نظم ''بانسری چپ ہے'' کا تجزیاتی مطالعہ

بانسری انسانی تہذیبی اور ادبی تاریخ کا نہایت اہم لیکن قدرے مشکل استعارہ بلکہ استعاراتی تلمیح ہے۔ سیرتِ طیبہ میں بانسری کی بابت روایات ایک الگ موضوع ہے۔ ان کے علاوہ یونانی اساطیر میں ایک طرف جنگلات کے دیوتا پین کو بانسری کا موجد گردانا جاتا ہے جب کہ دیگر روایات میں ایتھینا نامی دیوی کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے میڈوسا کی آہ و بکا کی نقل کرنے کے لیے الوز/Aulos نامی بانسری نما آلۂ موسیقی بنایا۔ ہندومت میں بھگوان کرشن کی بانسری کو اُلوہی حیثیت دی جاتی ہے۔ اسی طرح ہیر رانجھا کی داستان میں رانجھے کی ونجھلی دی مٹھڑی تان پر ہیر کے فدا ہونے کا قصہ برصغیر کی تہذیب و ثقافت میں بانسری کو بطور استعارہ یا علامت اجاگر کرتا ہے۔

تاہم ایسے استعارے کو برتنے کے لیے شاعر یا ادیب کا بہت بڑا ادبی قد ہونا کڑی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دشتِ خار میں خال خال مجنوں ہی سنبھل کے قدم رکھ پاتے ہیں۔ مولانا روم نے تو بانس سے جدا ہو کر بانسری بننے کے عمل کی طویل داستان اپنی مثنوی کے دو مسحور کن مصرعوں میں یوں سمو دی تھی:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

....

افتخار الحق

یہ حسن اتفاق ہے کہ ڈاکٹر سعادت سعید نے اپنے مجموعے میں پہلی نظم کا عنوان ''فراق'' رکھا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب نے مولانا روم کے زمانے کی بانسری کی فریاد کے تھک کر چپ ہو جانے تک کا قریباً نو صدیوں پر محیط فکری سفرنامہ اپنی نظموں کے مجموعے میں کھل کر بیان کیا ہے۔ کل چھتیس نظموں پر مشتمل اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں ''حرفِ آغاز'' کے عنوان سے باقاعدہ ایک مقالہ نما مضمون ہے جس میں شاعر نے مقامی ادبی دھرتی کے بانجھ پن کا نوحہ تھی ادب جیسی معنی خیز اصطلاح کی آنکھوں سے رویا ہے۔ اس ابتدائیے میں شاعر نے حقیقی معنوں میں معیاری ادب کی کم یابی پر نہایت وقیع باتیں کی ہیں جو ایک مقناطیسی قوت سے اپنی قرات کراتی ہیں۔

بنیادی طور پر ڈاکٹر سعادت سعید صاحب نے ان اہلِ قلم کی خاموشی کا مرثیہ تحریر کیا ہے جو سماجی دباؤ اور دیگر عوامل کے سبب حقیقی معیاری ادب تخلیق نہیں کر پاتے۔ اس رجحان پر تنقید کے تسلسل میں انھوں نے ٹی وی ڈراموں کی غیر معمولی مقبولیت کو معیاری ادب کے زوال کا ذمے دار ٹھہرایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عشروں پر محیط مشاہدے کی بنیاد پر مروج ادبی نظریات و معیارات کو چیلنج کیا ہے جو ان کے خیال میں کافی فرسودہ ہو چکے ہیں، جیسے ارسطو کا کتھارسس یعنی ادبی تخلیق کے ذریعے اندرونی گھٹن کو ختم کرنے کا نظریہ۔ اس پر طنز کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اسے شاید نرم بیانی / euphemism سے کام لیتے ہوئے جذباتی قے سے تشبیہ دی ہے ورنہ قدیم طبِ مغرب میں اسہال آور ادویات / laxatives کو drugs cathartic کہا جاتا تھا۔ اسی طرح انھوں نے ایرسٹی پس کے ہیڈونزم نظریے کو بھی مسترد کیا ہے جس کے تحت ادب کی تخلیق کا بنیادی مقصد ذہنی عیاشی ہے۔ ان کلاسیکی نظریوں کے تناظر میں ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں پر قدرے تفصیل سے بات کرتے ہوئے وہ اردو ادب کے داخلیت پسندوں کے فکری مغالطوں کی مدلل نشاندہی کرتے ہیں۔

بالآخر اپنے دیباچے کے اختتامی حصے میں حقیقت پسند اور ترقی پسند گروہوں کے تقابلی جائزے پر عمدگی سے گفتگو کر کے منطق استخراجیہ کے توسل سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے ادبی نظریات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر سعادت صاحب کی نظموں کے تجزیے کے لیے ان کا ابتدائیہ کنایہ آمیز رنگ میں کسی حد تک ان کی نظموں کی تفہیم کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کتاب کی نظموں کے قالب سے ان کی معنوی روح تک رسائی کرنا ایک کٹھن سفر سے کم نہیں۔ سب سے پہلے

ان نظموں کے حوالے سے ڈاکٹر سعادت سعید کی شاعری کے اسلوب کا تعین ضروری ہے کہ اسلوب اس طاقت ور محدب عدسے کی مانند ہے جس کے ذریعے متن و مشمولات سے وراجہانِ تفہیم قدرے واضح دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد ناقدانہ نگاہ گنجینۂ معنی کی طلسم کشائی کے قابل ہوتی ہے۔ جامع ترین لفظوں میں ان نظموں کا اسلوب" کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے" جیسا ہے اور اس کی بڑی وجہ ان کے نثری ابتدایئے میں موجود ہے، یعنی اہلِ قلم پر سماجی اور سیاسی دباؤ اور اس سے جڑے خدشات۔ ڈاکٹر صاحب کی نہایت حساس طبیعت اور زبردست قوتِ مشاہدہ و مطالعہ انھیں بظاہر وسیع و کشادہ جہانِ نطق و بیان کے گرد لگی ہوئی بے حد مہین لیکن اتنی ہی نوک دار خاردار باڑھ دکھا کر سمجھاتی ہے کہ آزادیِ اظہار کی تمام صورتیں جیسی نظر آتی ہیں، ویسی ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس ہر خلاق ذہن پر طرح طرح کی بندشوں اور قدغنوں کے سبب:

"ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد"

کا سماں کم و بیش ہر شعبۂ حیات میں اپنی جھلک دکھاتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید کی نظم" برنگِ قیس" سے ان کا اسلوب قاری کے تفہیمی پردے پر منعکس ہونا شروع ہوتا ہے:

" برنگِ قیس دنیا میں کسے حاصل ہے آزادی
کہ جس ماحول میں رہتے ہیں اس میں
فکر کا مکتب کہ جذبے کے مکاتب
فرد کا مذہب اداروں کے مذاہب
اپنی آزادی کا دم بھرنے سے خائف ہیں"

....

سعادت سعید کے نزدیک فکری آزادی کا نقطۂ عروج قیس کے جنون کی صورت ہے جس کی عریانی یعنی اصل آزادی تصویر کا پردہ بھی نہیں چھپا سکتا۔ جو شاعر آزادی کی حدود کو لامحدود کرنے کا خواہش مند ہو، اس کی بابت بلا تردد و تذبذب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے تخیل اور مشاہدے کی کائنات لامتناہی ہے اور وہ اپنے مشاہدے کا اظہار کرنے کے لیے جس ماحول، معاشرے یا میڈیم کا طالب ہے، اس کے اطراف میں بالکل یا بڑی حد تک برعکس ماحول اس کی تخیلاتی فضا میں شدید حبس پیدا کرنے اور قائم رکھنے پر مصر ہے۔ تاہم آزادی کی طلب یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ شاعر "ھل من مزید" کا قائل ہے اور وہ دلوں کے رشتوں پر زمانی قیود سے رہائی کا طلب گار بھی ہے۔ کتاب کی پہلی نظم" فراق" کے کچھ مصرعے اسی جانب اشارہ کرتے ہیں:

"اس کی آنکھوں کے تبسم
اور لہجے کے ترنم
میں بھی مستور تھا

منقلب گھڑیاں نہیں ہوں گی
نہ جیتے جی ہمارے روگ بدلیں گے کبھی"

....

یہاں منقلب گھڑیوں کے ساتھ "جیتے جی" کا تلازمہ قاری سے ترسیل وابلاغ کے ضمن میں فکری پختگی اور متن کی گہرائی میں مہارت سے شناوری کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے۔ گھڑیوں یا لمحوں کے منقلب ہونے سے بظاہر مراد ماضی کی طرف لوٹنا ہے لیکن اس تمنا کے باطن میں بہت کچھ اور ہے۔ حال کے اپنی جگہ منجمد ہونے یا وقت کی ازلی گرفت سے نجات کی خواہش جو ہر انسان کے لاشعور اور جبلت میں کندہ ہوتی ہے لیکن کوئی ماہر تخلیقی فنکار ہی اپنے کمال اظہار سے اجاگر کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ نظم "غنچۂ شوق" کا ایک بند وقت کی اسی دست درازی پر طنز کا رنگ اہلِ فکر کے سامنے لاتا ہے:

"پھر جوانی کے تقاضے بھی الگ ہوتے ہیں
برزخِ وقت میں گزرے ہوئے بے کل لمحے
راس آئے گا اسے لمبی مسافت کا شعور
"آتشِ عشق کا دریا ہے کہیں
ڈوب کے جانا ہوگا۔"

....

ہم سب جانتے ہیں عالمِ برزخ وہ نامعلوم مقام ہے جو ابدی انتظار کے لیے مخصوص ہے۔ یعنی وہ دنیا جہاں وقت کے دریا کی روانی پر ایک غیبی بند تعمیر کر دیا گیا ہے۔ جوانی کے تقاضوں کے بعد برزخِ وقت میں جیتے بے کل لمحوں کو مذکور کرنا بے حد معنی خیز ہے۔ گویا شاعر برزخِ وقت میں بھی بے کل لمحوں کا نہ صرف ادراک رکھتا ہے بل کہ انھیں جوانی کے تقاضوں پر منطبق کرنے کی شدید خواہش کا طلب گار بھی ہے۔

ان چند مثالوں سے طے ہو جاتا ہے کہ سعادت سعید کا اسلوب احتجاج، بے بسی پر فریاد اور وقت کے خلاف جدوجہد کی دعوت دینے کے عناصر میں گندھا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بیشتر نظموں میں راست بیانیہ اپنانے کے باوجود مکرر قرأت پر جابجا ناسٹلجیائی لہجہ اور کہیں کہیں تجریدیت کا مبہم سا سایہ دکھائی دیتا ہے تو کہیں کئی پرتوں میں ملفوف فہیم کی فضا سامنے آتی ہے۔

اسی اسلوب میں نہایت نفیس تمثیلی رنگ کے نگینے جگمگاتے نظر آتے ہیں اور ان نگینوں کی سب سے چمک دار کرن تجسیم نگاری ہے جسے برتنے کے لیے اعلیٰ درجے کی مشاقی درکار ہوتی ہے۔ اس مشاقی کا مظاہرہ متعدد نظموں میں بکثرت ملتا ہے جو تفہیم و توضیح کے نئے در وا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کی شاعری کا ایک اور نمایاں پہلو حیران کن ترکیب سازی ہے۔ ان کی نظموں میں مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل تراکیب کا انبار

سا لگا دکھائی دیتا ہے۔
اسلوب کے بعد نظمیہ شاعری کا ایک اہم عنصر موضوعات ومضامین کا انتخاب ہے۔ اس ضمن میں متذکرہ کتاب کسی حد تک الجھانے کا سامان کرتی ہے کیونکہ اتنے متنوع موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں کہ ناطقہ و باصرہ سر بگریباں سے ہونے لگتے ہیں۔ روایتی عشقیہ جمالیات سے لے کر عصری رجحانات، انفرادی و اجتماعی نفسیات اور اساطیری حوالوں تک ہمہ رنگ نظموں کا ایک دلکش مگر پراسرار طیف سا بنتا دکھائی دیتا ہے جس میں کبھی تو مختلف رنگ فرد فرد پڑھنے کو دل چاہتا ہے تو کبھی ان کی تالیف کر کے ایک ہی نسخے کی صورت لطف اندوز ہونے کی خواہش بیدار ہوتی ہے۔ لگتا ہے اس کتاب کی کامیابی کی کلید یہی متضاد رنگ ہے۔ ایسی نظمیں قاری کو اپنی تربیت کرنے پر مائل کرتی ہیں۔ قاری مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ مزید مطالعہ کرے اور جدید شاعری کے خد و خال سے شناسائی پیدا کرے۔ مشہور اساطیری کردار امیر حمزہ کا اپنے درون اور پھر عصری منظر نامے سے کیسے انسلاک کیا جا سکتا ہے۔ اس عمل سے لطف کشید کرنے کے لیے نظم "داستانِ امیر حمزہ لکھوں----" سے کچھ مقتبس حصہ دیکھیے اور یہ بھی دیکھیے کہ طویل ترکیب سازی کے عمل کو بوجھل ہونے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے:

"داستانِ امیر حمزہ لکھوں
کہ اپنی ہی وارداتوں کا بت بناؤں
میں شامِ عہدِ بلائے وحشت
میں رنگِ خوف مکانِ ویراں
خموش، خالی، اجڑتا شیشہ
اداس کالک کے خونی پنجے
مری نگاہوں کے آئینوں میں سلگ رہے ہیں"

....

اس بند میں واحد متکلم سے شاعر کی ہی ذات لینے کا حکم لگانا محال ہے کہ یہی صیغہ وقت کی نمائندگی بھی کر رہا ہے۔ شامِ عہدِ بلائے وحشت سی معنی خیز ترکیب اس مفروضے کے حق میں شہادت کے لیے کافی ہے۔ لگتا ہے اس سے پہلے ہوائے صبحِ الست کا تذکرہ قصداً نہیں کیا گیا۔ اس سے اگلی نظم "تصویر" کے ابتدائی تین مصرعے اپنی جگہ ایک ثلاثی نما نظم کی تاثیر رکھتے ہیں:

"میں اظہار کا پیاسا ساحل
جس میں غرق ہوئے ہیں
کتنے بہتے دریا"

....

یہی مصرعے ہیں جو ایک گھٹن سے بھرپور ماحول میں آزادیِ فکر کا گلا گھونٹنے کے کراہت وحشت انگیز منظر کی بُنت کرتے ہیں۔
سعادت سعید کی نظموں کا ایک بڑا موضوع

انسان اور اس کا ذہنی و سماجی سفر ہے جس کی بنیاد پر انھوں نے شاندار مضامین پر مبنی نظموں کی عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم "آدمی نامہ" سے لے کر ن م راشد کی نمائندہ نظم "آدمی سے ڈرتے ہو" تک جانے کتنے ہی شعرا نے اس عظیم موضوع پر معرکہ الآرا نظمیں لکھیں لیکن اکیسویں صدی کے سعادت سعید کے ہاں اس موضوع کو کافی منفرد اور قدرے جیکھے انداز میں برتا گیا ہے۔ الہامی کتب پر یقین رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ تورات کی کتاب پیدائش کے علاوہ قرآن نے انسان کی برتری کا معیار یہ بتایا:

وعلّم آدم الاسماء

یعنی ہم نے آدم کو اشیا کے نام رکھنے کا علم دیا۔ اس قرآنی دعوے کی معنوی باریکی یہ بتاتی ہے کہ انسان کو تخلیقی ذہن عطا گیا ہے کیونکہ انسان کوئی نئی ایجاد یا دریافت کرے تو ہی نام رکھنے کی نوبت آتی ہے۔ سعادت سعید صاحب نے البتہ اسی موضوع کو اپنی نظم بعنوان "نام ہی سے" میں بہت مختلف زاویے سے دیکھا ہے۔ انھوں نے انسان کی اسی صفت کی بنیاد پر آدمیت سے انسانیت کے ارتقائی مراحل کو بڑی مہارت سے منظوم کیا ہے۔

ان کے نزدیک اشیاء کے نام رکھ کر حضرت انسان نے اپنے آدمی ہونے کا ثبوت تو دے دیا لیکن ایسا کرتے ہوئے اس نے ان کی اصل شناخت کو متاثر کیا ہے۔ لہٰذا سعادت سعید کے مطابق انسانیت کا حقیقی مرتبہ اس سے ذرا آگے وہ درجۂ ارتقا ہے جہاں انسان آدمیت سے جڑی وحشت کو شکست دینے کے درپے ہے:

"نام ہی سے ہم نے پہچانے
حیات بے کراں کے سلسلے
رشتہ ہائے بندگی
بے چارگی کے زاویے
خشکیوں اور پانیوں کے رزمیے
آسماں کے حاشیے
نام دے کر ہر کی اشیا کو ہم نے
ان سے چھینی
ان کے
روز و شب کی خوشبو
ان کو بخشے تخلیے
انسان میرا نام ہے
میں وحشیوں سے برسرِ پیکار ہوں"

....

اسی مضمون کے تسلسل میں وہ ایک اور نظم "اٹھ گیا سینۂ گیتی سے" میں یوں مخاطب ہوتے ہیں:

"اٹھ گیا سینۂ گیتی سے وہ انسان کہ جو
دورِ تہذیب کا عنوان ہوا کرتا تھا
آؤ فریاد کریں
کسی معبد میں چلیں یا کسی مے خانے میں

آنسوؤں سے اسے آباد کریں
اس کے جانے کا سبب یاد کریں"

....

ان مصرعوں میں انسان کے ضدِ ارتقائی سفر کا نوحہ جامعیت سے سمو کر بین السطور وہی آدمی اور انسان کا قضیہ مذکور ہے۔ ایک اور نظم جو خاصی چونکا دینے والی ہے، اس میں انسان نے سائنسی ترقی کے نام پر ماحولیاتی بگاڑ کا جو گھناؤنا کھیل کھیلا، اس کی چشم کشا داستان رقم کی گئی ہے۔ نظم کا عنوان ہے:

"اک خواب کہ جس کا انت نہیں"

"اچانک زمیں پھٹ گئی
آسمانی نگاہوں نے دیکھا کہ
اک ایک ذرے میں
مدفون تھے لاکھوں انسان
اچانک فضا
چیخی روشنی کے
سمندر میں ڈوبی
زمیں پر چکاچوند سورج اترنے لگے
وہ دھماکے ہوئے"

....

اس نظم کی خوبصورتی یہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے دھیان ہیروشیما اور ناگاساکی کے ساتھ نائن الیون کی طرف بھی جاتا ہے، روزِ حشر بھی تفہیم کی سکرین پر ابھرتا ہے اور بعینہٖ بگ بینگ بھی ادراک کی راہداری میں داخل ہونے کی کاوش کرتا ہے۔ انسانی نفسیات پر ڈاکٹر صاحب کی نظم "شخصیت پرستی" خاصے کی چیز ہے۔ اس کے مصرعے تیسری دنیا کے عام آدمی کی نفسیاتی کمزوری بے نقاب کرتے ہیں کہ کیسے ایک اوسط ذہن شخصیاتی طلسم کے زیرِ اثر ایک طرف خود شخصیت پرستی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف اپنی ممدوح ہستی کو الوہی رفعتوں تک لے جانے کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ فرد پرستی کا یہ رجحان یوں تو ہر شعبۂ حیات میں قدم قدم پر ملتا ہے لیکن اس کا نمایاں ترین اطلاق سیاست پر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

سیاسی و تہذیبی ارتقا میں مغربی ممالک بڑی حد تک اس عمل سے اس لیے نجات پا چکے ہیں کہ وہاں اداروں کی مضبوطی نے شخصیات کو ثانوی حیثیت دے دی ہے لیکن پسماندہ ممالک کے عوام اب تک شخصیاتی طلسم یا پرسنلیٹی کیرزما / charisma personality کی بھول بھلیوں میں اسی لیے پھنسے ہوئے ہیں اور مستقبل قریب میں ان سے نکلنے کا امکان کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ دراصل جماعی اور عملی جدوجہد کے بجائے یہ کسی مسیحا کے انتظار میں رہتے ہیں اور جیسے ہی ان کے آئیڈیل سے ملتا جلتا انسان ملتا ہے، اس کی اندھا دھند پیروی کو اپنا فریضہ

گروانتے ہوئے اس مشن میں لگ جاتے ہیں کہ اسے روحانی ہستی قرار دیا جائے۔ تاہم کچھ عرصے بعد جب یہی مسیحا ان کی توقعات پر پورا نہیں اترتا تو یہ کسی اور سامری جادوگر کو تلاشنے لگتے ہیں اور یہ صورتِ حال یونہی جاری رہتی ہوئے غالب کے اس شعر کی تصویر بن جاتی ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اس موضوع پر امریکی صحافی کرسٹینا لیمب نے ایک اہم کتاب لکھی جس کا عنوان پاکستانی عوام کے مزاج کی مناسبت سے بہت دلچسپ ہے:

Allah for Waiting

نظم ''شخصیت پرستی'' کی یہ سطور دیکھیے جو کچھ ایسا ہی منظرنامہ بیان کر رہی ہیں:

''مجھ کو شخصیت پرستی کا جنوں
بوسۂ نقشِ خیالِ مرشداں
لے گیا ذاتی وقار
میرے مرشد
قابلِ نفرت بھی ہیں قابلِ تعزیر بھی
میں نے ان کو دیوتا جانا''

اس فکری گورکھ دھندے سے نکلنے کا واحد راستہ معروضی طرزِ تفکر و تجزیہ اور تحمل و رواداری کی کشادہ وادی میں تلاش کرنا افضل عمل ہوگا اور اس راہداری کا اختتام صحت مند مکالمے کی بیٹھک میں ہوتا ہے۔ خیر یہ معاملہ وقت اور تاریخ کی عدالت کے سپرد کرنا ہی بہتر ہوگا۔ دعا ہے کہ ہم پاکستانی اس فرسودہ طرزِ فکر سے نجات کی کوئی صورت پانے کے قابل ہو جائیں۔

انسان اور انسانیت کی تاریخ کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی شہکار نظم ''بانسری چپ ہے'' میں جس خوب صورتی اور استعاراتی انداز میں پیش کیا ہے، وہ کچھ انھی کا خاصہ ہے کہ ایسا نفیس اور پراسراریت میں لپٹا بیانیہ کم کم ہی ملتا ہے۔ نظم میں بہتی فطری روانی اس کی اضافی خوبی ہے جب کہ نولفظیت/ Neologism کا عنصر شاعر کی ارفع درجے کی اختراعی صلاحیتوں کی غماز ہے۔ پہلے تو نولفظیت پر مبنی مصرے دیکھیے:

''روز سب جمع ہی تو کرتے ہیں
فرق و تقسیم کی روایت ہے
روز مضروب بھی تو ہوتے ہیں
ان کو بس'' حاصلے'' نہیں ملتے''

مضروب کی ذو معنویت کو ذرا نئے لفظ'' حاصلے '' سے ملا کر دیکھیے۔ حاصلے یعنی حاصلِ قسمت وغیرہ اور مضروب یعنی مضروب وقت یا مضروب تقدیر کے حوالے سے تفہیم خوب نکھر کر ابھرتی ہے۔ نظم کے پہلے دو مصرعوں کے

بعد کچھ حصے چھوڑ کر نظم کی روح کے درجے پر فائز مصرعے پیش کروں گا:

"بانسری چپ ہے رات ناطق ہے
کس کی سرگوشیوں کی رم جھم ہے
ایک ہی حرف تھا ہمیں درکار
ہوّزوں ابجدوں کے مارے ہیں
آپ اچھے بدوں کے مارے ہیں
میری موجودگی سے وہ موجود
میں ہی شاہد ہوں میں ہی ہوں مشہود
اک دیا ہے کہ جس کا ہے یہ دُود
ہے زیاں جس کا اور کس کا سُود"

....

یہ جان دار تہہ دار مصرعے قاری کو آزادی دیتے ہیں کہ وہ انھیں "اکو الف ترے درکار" کی توسیعی و تفسیری صورت گردانے، وحدت الوجود کی طرف دھیان دے کہ وحدت الشہود کی باریکیوں پر غور کرے یا پھر ان کی اختلاط شدہ امکانی صورت کے تناظر میں معانی اخذ کرے۔ ایک ضمنی نکتہ البتہ یہ ہے کہ "ابجدوں ہوّزوں" کا ذکر کر کے ڈاکٹر صاحب نے حروفِ تہجی یاد کرنے کے قدیم اور تقریباً متروک کلیے کی یاد تازہ کرا دی جس کی ایک سطر یوں ہے:

ابجد ہوّز حُطّی کلمن

ڈاکٹر صاحب کی نظموں میں جہاں جہاں وارداتِ قلب اور معاملہ بندی کے مضامین آئے ہیں، ان میں بیشتر مقامات پر انھوں نے خود کلامی کا اندازِ تکلم اختیار کیا ہے اور یہ بھی جدید ترین شاعری کی نمایاں شناختی علامات میں شمار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نظم "بارشوں کے موسم میں" کے یہ مصرعے کسی بھی صاحبِ حسِ جمالیات کے دل میں ترازو ہونے کے لیے کافی ہیں:

"بارشوں کے موسم میں
دل کے مرغزاروں میں
ناگہاں مسرّت کی کُوکتی ہے خاموشی
پُرہجوم رستوں کی بھیگی اتری مجھ کو
مُشک بار لمحوں کی داستاں سناتی ہے
کوہسار ڈھلتے ہیں
سبزہ زار ڈھلتے ہیں
آبشار گاتے ہیں اختلاط کے نغمے"

....

اس اقتباس کا تیسرا مصرع میرے مضمون کے عنوان کی تائید و توجیہ کرتا ہے۔ دیگر کئی نظموں میں ایسے ہی مترنم، رقاص اور رنگ و خوشبو میں ملبوس مصرعے ڈاکٹر صاحب کی ان موضوعات پر مضبوط اور فطری گرفت کے عکاس ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ کریم ڈاکٹر سعادت سعید کو صحت و سلامتی بھری طویل عمر عطا کرے تا کہ وہ اپنے قلمِ تخیل سے جدید قاری کے لیے "تخلیق کا سامانِ سفر تازہ کرتے رہیں"

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نصیر احمد اسد کی نئی تصنیف ’’اقبال شناسی‘‘

ڈاکٹر نصیر احمد اسد کی نئی تصنیف ’’اقبال شناسی‘‘ ایک اہم تحقیقی کاوش ہے، جس میں بالخصوص شہر سیالکوٹ اور اقبال شناسی کی روایت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب سیالکوٹ سے وابستہ اُن اہلِ علم، محققین، ناقدین اور دانش وروں کی علمی خدمات کا احاطہ کرتی ہے جنھوں نے علامہ محمد اقبال کی شخصیت، فکر، فلسفے اور فن کو سمجھنے اور اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقبال پر کام کرنے والی ابتدائی شخصیات کے ساتھ ساتھ موجودہ عہد کے محققین اور اقبال شناسوں کی تحقیقی خدمات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یوں یہ تصنیف اقبال شناسی کی ایک مسلسل علمی روایت کو سامنے لاتی ہے اور یہ دکھاتی ہے کہ اقبال کے شہر سیالکوٹ میں ان کے فکر و فن کے مطالعے کا سلسلہ مختلف ادوار میں کس طرح آگے بڑھتا رہا۔

ڈاکٹر نصیر احمد اسد اس سے قبل بھی سیالکوٹ کی ادبی تاریخ اور اقبالی مطالعات کے حوالے سے کام کر چکے ہیں۔ ان کا تحقیقی مضمون ’’اقبال شناسی کے تناظر میں فیض اور جابر علی سید کا اختصاصی مطالعہ‘‘ بھی سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والی اہم اقبال شناس شخصیات کے کام کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس تحقیق میں فیض احمد فیض اور جابر علی سید کے اقبالی مطالعات کو خصوصی طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ ’’اقبال شناسی‘‘ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ محض علامہ اقبال کے فکر و فن کا عمومی مطالعہ نہیں بل کہ سیالکوٹ میں اقبال شناسی کی علمی روایت کا ایک مرتب اور مربوط جائزہ پیش کرنے کی کوشش ہے۔ اس نوعیت کا کام اقبالیات کے طلبہ، محققین، اساتذہ اور سیالکوٹ کی ادبی تاریخ کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔

سیالکوٹ کو اردو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل ہے اور اقبال کے علاوہ فیض احمد فیض، جابر علی سید اور دیگر اہلِ قلم سے اس خطے کی ادبی نسبت اس کی علمی شناخت کو مزید نمایاں کرتی ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد اسد

کومل شہزادی

کے تحقیقی کام میں بھی سیالکوٹ کی ادبی روایت اور یہاں کے اہلِ قلم کو نمایاں جگہ حاصل رہی ہے۔

خواجہ عبدالحمید عرفانی کی اقبال شناسی اور اقبال کو ایران میں متعارف کرانے کی کوششیں ہیں۔ مصنف نے ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اقبالیاتی تحقیق محض پاکستان تک محدود نہیں رہی بل کہ ایران جیسے اہم فارسی ادبی مرکز میں بھی اقبال کے فکروفن کو متعارف کرانے میں بعض اہلِ علم نے اہم کردار ادا کیا۔

خواجہ عرفانی کی اقبال شناسی کا ایک نمایاں پہلو ان کی ایران سے علمی و ادبی وابستگی ہے۔ مصنف نے ان کی تصانیف میں ''اقبال پر ایرانیوں کی نظریں''، ''اقبال ایران'' اور ''پیام اقبال'' کا ذکر کیا ہے۔ ان کتابوں کے ذریعے انھوں نے ایرانی اہلِ علم اور قارئین کے سامنے اقبال کے افکار کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ خصوصاً پیام اقبال میں اقبال کے پیغام کو ایران کے علمی ماحول سے مربوط کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔

مصنف نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ خواجہ عرفانی کی اقبال شناسی صرف تعارفی نوعیت کی نہیں بل کہ تحقیقی، تنقیدی اور ابلاغی جہات رکھتی ہے۔ انھوں نے اقبال کے ایرانی اثرات، ایرانی اہلِ علم کی اقبال سے آشنائی اور پاکستان و ایران کے درمیان اقبالیاتی تعلق کو موضوع بنایا۔ اس طرح خواجہ عرفانی نے اقبال شناسی کو ایک وسیع بین الاقوامی اور بالخصوص پاک ایران علمی تناظر عطا کیا۔ جیسے ابتدا میں ڈاکٹر نصیر نے یوں رقمطراز ہیں:

''اقبال کو ایران میں متعارف کرانے کا سہرا خواجہ عرفانی کے سر جاتا ہے - عرفانی صاحب کی ادبی خدمات بے پایاں ہیں، یہاں صرف عبدالحمید عرفانی کی اقبال شناسی کا جائزہ لیا ہے۔''

نتیجتاً یہ اقتباس اس امر کی اہم شہادت ہے کہ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے اقبال شناسی، بالخصوص ایران میں اقبال کے تعارف اور پاک ایران اقبالیاتی تعلق کے فروغ میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔ ان کی تصانیف اقبال کے عالمی اثرات اور ایرانی اہلِ علم کی اقبال سے وابستگی کو سمجھنے کے لیے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مصنف ڈاکٹر نصیر احمد اسد نے مظفر نظامی کی اقبال شناسی کو خاص طور پر عشقِ رسولؐ کے

تناظر میں نمایاں کیا ہے۔ مظفر نظامی نے علامہ اقبال کے شعری سرمایے کا مطالعہ کرتے ہوئے ان اشعار کو الگ سے جمع کیا جن میں عشقِ رسولؐ کی کیفیت، عقیدت اور وابستگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی کاوش کا بنیادی مقصد اقبال کے منتشر شعری مواد میں موجود عشقِ رسولؐ کے فکری و جذباتی پہلوؤں کو یکجا کر کے ایک مربوط صورت میں پیش کرنا ہے۔ نظامی کے کلام کی ترتیب واسلوب کے حوالے سے مصنف کی رائے ملاحظہ کیجیے:

''نظامی نے علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ان تمام اشعار کو جن میں عشقِ رسول کی جھلک نمایاں ہے، ایک جگہ پر یکجا کر کے اقبال کے عشقِ رسول کے نام سے تعبیر کیا ہے۔''

مظفر نظامی کی کاوش کی ایک اہم ادبی و تحقیقی حیثیت متعین کرتا ہے۔ اگرچہ یہ تصنیف غیر مطبوعہ رہی، تاہم اس کا موضوع اقبال شناسی میں اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے اقبال کے کلام میں عشقِ رسولؐ کے منتشر اشارات کو ایک مستقل مطالعاتی موضوع کے طور پر سامنے لایا گیا۔ یوں مظفر نظامی کا کام سیالکوٹ کی اقبال شناسی میں ایک ایسی قابلِ ذکر کوشش کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اقبال کے عشقِ رسولؐ کو مرکز بنا کر ان کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصنف کے مطابق طاہر شادانی علامہ اقبال کے بڑے شیدائی تھے۔ انھوں نے اقبال کی تصنیف ''ارمغان حجاز'' کے فارسی حصے کا ترجمہ کیا اور اقبال کے حوالے سے تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اقبال شناسی محض عقیدت تک محدود نہیں بلکہ ترجمہ، تحقیق اور تنقید جیسے علمی ذرائع سے بھی وابستہ تھی۔ مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقبال کی فارسی شاعری کے بہت سے تراجم ہو چکے ہیں اور یہ تراجم اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ جو لوگ فارسی نہیں جانتے وہ ترجمے کے ذریعے اقبال کی روح تک پہنچ سکتے ہیں اور اقبال کے افکار و نظریات کو جان سکتے ہیں۔''

اس اقتباس کی اہمیت یہ ہے کہ مصنف نے اقبال شناسی کو صرف اقبال کی شخصیت پر عقیدت مندانہ گفتگو تک محدود نہیں رکھا بلکہ تحقیق، ترجمہ، تنقید اور فکری تفہیم کو بھی اقبال شناسی کا حصہ قرار دیا ہے۔ یہی نقطہ ''اقبال

شناسی" کو ایک باقاعدہ علمی و تحقیقی شعبے کے طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ اقتباس اس امر کو اجاگر کرتا ہے کہ اقبال کی ہمہ جہت فکر کو سمجھنے کے لیے ان کی شاعری، خصوصاً فارسی شاعری، عشقِ رسولؐ، صوفیانہ افکار اور فلسفۂ خودی کا مطالعہ ضروری ہے۔ ساتھ ہی سیالکوٹ کے اقبال شناسوں کی علمی خدمات کو محفوظ کرنا اقبالیاتی تحقیق کے تسلسل کے لیے نہایت اہم ہے۔

محمد انور صوفی کا تعلق سیالکوٹ سے رہا اور وہ اقبال کے افکار و شخصیت سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ مصنف کے مطابق انہوں نے اپنی کتاب "دامانِ خیال و فن" میں علامہ اقبال کے حوالے سے متعدد مضامین شامل کیے، جن سے ان کے اقبال فہمی کے رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ "اقبال شاعرِ انسانیت"، "اقبال کا خطاب"، "اقبال کی توقعات" اور "ہم سے اور علامہ اقبال کی ایک رباعی" جیسے مضامین بھی ان کی اقبالیاتی دلچسپی اور مطالعے کی وسعت کو ظاہر کرتے ہیں۔ محمد انور صوفی کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ

"محمد انور صوفی نے اپنی کتاب 'دامانِ خیال و فن' میں حضرت علامہ اقبال پر مضامین لکھ کر اقبالیات اور اقبال شناسی سے اپنے لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔ صوفی صاحب مصنف کی یہ کتاب شخصیت پرست لاہور میں ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔"

اقتباس میں سوانحی تعارف، علمی خدمات اور تصانیف کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ تاہم اس حصے میں محمد انور صوفی کے مذکورہ مضامین کے تنقیدی منہج، فکری نتائج اور اقبال کے کلام کی تعبیر پر تفصیلی گفتگو نہیں ملتی۔ اگر مصنف ان مضامین کے موضوعات اور تحقیقی امتیازات کا مختصر تجزیہ بھی پیش کرتے تو اقبال شناسی کے حوالے سے یہ تعارف مزید جامع اور تحقیقی بن سکتا تھا۔ یہ اقتباس اس امر کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ محمد انور صوفی نے اقبال کی شخصیت اور فکر کو مختلف زاویوں سے موضوعِ مطالعہ بنایا اور سیالکوٹ کی اقبال شناسی کی روایت میں اپنا حصہ ڈالا۔

اس اعتبار سے "اقبال شناسی" صرف ایک کتاب نہیں بلکہ سیالکوٹ میں اقبال فہمی اور اقبالی تحقیق کی ایک اہم علمی دستاویز قرار دی جا سکتی ہے، جو ماضی کے اقبال شناسوں سے لے کر عصرِ حاضر کے محققین تک ایک فکری و تحقیقی سلسلے کو یکجا کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

جاوید صدیق بھٹی کا شعری اور نثری اسلوب

اردو اور پنجابی ادب کی معاصر فضا میں بعض قلم کار ایسے ہیں جن کی شناخت محض ان کی تصانیف کی تعداد سے نہیں بل کہ ان کے فکری رویے، تخلیقی وفور، اسلوبی انفرادیت اور انسانی وابستگی سے ہوتی ہے۔ جاوید صدیق بھٹی بھی ایسے ہی ہمہ جہت اور فعال ادیب و شاعر ہیں۔ لاہور کی ادبی دنیا میں ان کا نام ایک ایسے زود نویس، متحرک اور صاحبِ مطالعہ تخلیق کار کے طور پر سامنے آتا ہے جس نے شعر و ادب کی مختلف اصناف میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ ان کی اب تک بیس کتب کی اشاعت اور ان کی شخصیت و ادبی خدمات پر دس کتب کا تصنیف ہونا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ان کی تخلیقی شخصیت نے اہلِ علم و ادب کی توجہ مسلسل اپنی جانب مبذول کی ہے۔ بی ایس، ایم اے اور ایم فل کی سطح پر ان کی شخصیت، شاعری اور ادبی خدمات کے حوالے سے تحقیقی مقالات کا لکھا جانا بھی ان کے ادبی مرتبے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

جاوید صدیق بھٹی کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی دو لسانی تخلیقی شناخت ہے۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی شعر کہتے ہیں اور دونوں زبانوں میں ان کا تخلیقی سفر محض اظہارِ ذات تک محدود نہیں بل کہ اپنے عہد کے مسائل اور انسانی زندگی کی پیچیدگیوں سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں عصری شعور، رومان، انسانی محرومیوں کا احساس، سماجی ناانصافی کے خلاف ایک نرم مگر موثر احتجاج اور فنی پختگی باہم مل کر ایک ایسا شعری مزاج تشکیل دیتے ہیں جو قاری کو محض متاثر نہیں کرتا بل کہ اسے سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔

جاوید صدیق بھٹی کے شعری اسلوب کا بنیادی وصف روانی ہے۔ ان کے ہاں لفظ

مزمل حسین

شعر پر بوجھ نہیں بنتا بل کہ معنی کی ترسیل کا وسیلہ بن کر ایک قدرتی بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ ان کی شاعری میں پیچیدہ اور ثقیل تراکیب کی نمائش کے بجائے ایک ایسی سادگی اور لطافت دکھائی دیتی ہے جو شعر کو عام قاری کے لیے بھی قابلِ فہم بناتی ہے۔ تاہم یہ سادگی سطحی نہیں؛ اس کے پس پردہ ایک گہرا فکری شعور موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعر پہلی قرأت میں دل کو چھوتا ہے اور دوسری قرأت میں ذہن کے دروازے کھولتا ہے۔

ان کے شعری اسلوب میں رومان بھی ایک اہم عنصر ہے مگر یہ رومان محض حسن و عشق کے روایتی تصورات تک محدود نہیں۔ ان کے ہاں محبت ایک وسیع انسانی قدر بن کر سامنے آتی ہے۔ محبوب کی یاد، تنہائی، انتظار، قربت اور جدائی جیسے جذبات کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں کی نزاکت اور زندگی کی معنویت بھی ان کے شعری اظہار کا حصہ بنتی ہے۔ یوں ان کا رومان زندگی سے فرار کا وسیلہ نہیں بل کہ زندگی کو زیادہ گہرائی سے محسوس کرنے کا ایک راستہ بن جاتا ہے۔

جاوید صدیق بھٹی کی شاعری کا ایک نہایت اہم پہلو ان کا عصری شعور ہے۔ وہ اپنے زمانے سے لاتعلق شاعر نہیں۔ معاشرتی ناہمواری، محروم طبقات کی مشکلات، انسانی حقوق کی پامالی، عدم مساوات اور عام انسان کے دکھ ان کے تخلیقی احساس کو متحرک کرتے ہیں۔ تاہم ان کا احتجاج بلند آہنگ نعرے کی صورت اختیار نہیں کرتا بل کہ شعری لطافت اور جمالیاتی پیرایے میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ یہی لطیف احتجاج ان کے شعری اسلوب کو مؤثر بناتا ہے۔ وہ قاری کو حکم نہیں دیتے؛ اسے سوچنے، محسوس کرنے اور اپنے اردگرد کی دنیا کو نئے زاویے سے دیکھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

ان کی فکری شخصیت میں لبرل، ترقی پسند اور انسان دوست رویے نمایاں ہیں۔ یہی اوصاف ان کی شاعری میں بھی منعکس ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو مذہب، طبقے، زبان، علاقے یا کسی دوسری شناخت کے محدود خانے میں بند کرنے کے بجائے اسے ایک مکمل انسانی وجود کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاں محبت، رواداری، آزادی، احترامِ آدمیت اور سماجی انصاف بنیادی انسانی اقدار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری محض جذباتی اظہار نہیں بل کہ ایک ایسے انسانی منشور کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے جس میں بہتر اور زیادہ منصفانہ معاشرے کی آرزو محسوس کی جا سکتی ہے۔

پنجابی شاعری میں بھی جاوید صدیق بھٹی کی تخلیقی صلاحیت اپنے الگ رنگ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ پنجابی زبان کی مٹی، اس کی

ثقافتی روح، محاوراتی فطرت اور عوامی لہجے سے ان کی واقفیت ان کے پنجابی اظہار کو فطری بناتی ہے۔ وہ پنجابی کے مزاج میں موجود سادگی، بے ساختگی اور جذباتی شدت سے استفادہ کرتے ہیں اور اسے جدید عہد کے مسائل سے مربوط کر دیتے ہیں۔ یوں ان کی پنجابی شاعری روایت اور عصریت کے درمیان ایک خوب صورت ربط قائم کرتی ہے۔

ان کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو نثر نگاری ہے۔ اگر شاعری ان کے احساسات اور تخلیقی وجدان کا جمالیاتی اظہار ہے تو نثر ان کے فکری اور تجزیاتی شعور کا مظہر ہے۔ ان کے لاتعداد تجزیاتی مضامین مختلف رسائل، جرائد اور ادبی صفحات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین میں موضوع کے انتخاب سے لے کر اس کی پیش کش تک ایک باشعور لکھاری کی بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔ وہ محض معلومات فراہم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جاوید صدیق بھٹی کا نثری اسلوب بھی ان کی شاعری کی طرح رواں، سبک اور لطیف ہے۔ ان کی نثر میں لفظوں کی نمائش یا ثقالت کے بجائے ایک قدرتی بہاؤ ملتا ہے۔ جملے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں اور تحریر میں ایسی دل آویزی پیدا کرتے ہیں کہ قاری خود کو مضمون کے فکری اور جذباتی ماحول میں محو پاتا ہے۔ ان کی نثر کا حسن یہی ہے کہ وہ علمی اور تجزیاتی گفتگو کو خشک اور بے رنگ نہیں ہونے دیتے بل کہ اسے ادبی لطافت عطا کرتے ہیں۔

ان کی نثر میں شاعر کی حساسیت اور تجزیہ نگار کی بصیرت ایک ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ یہی امتزاج ان کے نثری اسلوب کو منفرد بناتا ہے۔ وہ کسی مسئلے کو صرف عقلی سطح پر نہیں دیکھتے بلکہ اس کے انسانی اور جذباتی پہلوؤں کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان کے مضامین میں فکر اور احساس، دلیل اور جذبہ، تجزیہ اور جمالیات ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔

جاوید صدیق بھٹی کی شخصیت کا روادار، وضع دار اور ملنسار پہلو بھی ان کی تحریروں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ہاں اختلاف رائے کے باوجود احترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ان کی تنقید یا تجزیہ کسی شخصیت کو زیر کرنے کے بجائے کسی مسئلے کو سمجھنے کی کوشش معلوم ہوتا ہے۔ یہی رویہ ان کے ادبی مزاج میں ایک خوش گوار شائستگی پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے قاری سے مکالمہ کرتے ہیں، اس پر اپنی رائے مسلط نہیں کرتے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جاوید صدیق بھٹی ایک فعال اور زود نویس قلم کار ہیں۔ زود نویسی اگر محض کثرتِ تحریر کا نام ہوتو اس

کی کوئی خاص ادبی اہمیت نہیں، لیکن جب کثرتِ اظہار کے ساتھ فکری تسلسل، اسلوبی روانی اور موضوعاتی تنوع بھی موجود ہو تو یہی زود نویسی تخلیقی توانائی کی علامت بن جاتی ہے۔ جاوید صدیق بھٹی کے ہاں یہی صورت نظر آتی ہے۔ ان کی مسلسل ادبی سرگرمی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ادب کو محض شوق نہیں بلکہ ایک مسلسل فکری اور تخلیقی عمل سمجھتے ہیں۔

ان کے ادبی سفر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے فن پر باقاعدہ تحقیقی کام ہوا ہے۔ بی ایس، ایم اے اور ایم فل کی سطح پر ان کی شخصیت اور شعری و ادبی خدمات کو موضوعِ تحقیق بنانا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کا ادب وقتی پذیرائی سے آگے بڑھ کر تحقیقی توجہ کا مستحق قرار پایا ہے۔ کسی تخلیق کار کے لیے اس سے بڑھ کر اہم بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی تخلیقات نئی نسل کے محققین کو سوال اٹھانے، تجزیہ کرنے اور مزید مطالعے پر آمادہ کریں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جاوید صدیق بھٹی کا شعری اور نثری اسلوب ان کی ہمہ جہت شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری میں محبت ہے مگر محض رومان نہیں؛ احتجاج ہے مگر محض نعرہ نہیں؛ ترقی پسندی ہے مگر نظریاتی جبر نہیں؛ سادگی ہے مگر سطحیت نہیں۔ اسی طرح ان کی نثر میں روانی ہے مگر بے فکری نہیں؛ تجزیہ ہے مگر خشکی نہیں؛ ادبی حسن ہے مگر تصنع نہیں۔

جاوید صدیق بھٹی کا اصل امتیاز شاید یہی ہے کہ انہوں نے دل اور دماغ، احساس اور فکر، روایت اور عصریت، اردو اور پنجابی، شاعری اور نثر کے درمیان ایک خوب صورت رشتہ قائم کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں انسان مرکزِ نگاہ ہے اور انسان کی خوشی، آزادی، عزت اور حق ان کے تخلیقی شعور کی بنیادی قدریں محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ادب محض پڑھا نہیں جاتا بلکہ محسوس بھی کیا جاتا ہے۔

ایک ایسے عہد میں جب ادب کبھی نعرے میں اور کبھی محض لفظی کرتب میں گم ہونے لگتا ہے، جاوید صدیق بھٹی کی تخلیقی آواز ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ ادب کی اصل قوت اس کے انسان دوست جذبے، فکری بیداری، جمالیاتی لطافت اور سچے احساس میں پوشیدہ ہے۔ ان کا شعری اور نثری اسلوب اسی قوت کا مظہر ہے۔ ان کی تحریر قاری کو اپنی گرفت میں لے کر اسے محض الفاظ کی دنیا میں نہیں رکھتی بلکہ زندگی، معاشرے اور انسان کے بارے میں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی کسی بڑے ادیب کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

☆☆☆☆☆

قدسیہ قدسی: خیبر پختونخوا کی اولین خاتون سفرنامہ نگار

اردو ادب کی تاریخ میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا تخلیقی سفر کسی ایک صنف یا ایک دائرے تک محدود نہیں رہتا بل کہ ان کی فکری وسعت اور ادبی صلاحیتیں مختلف میدانوں میں اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ایسی ہی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت قدسیہ قدسی کی ہے، جنھوں نے شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ وہ نہ صرف اردو ادب میں ایک معتبر نام ہیں بلکہ فارسی زبان و ادب سے گہری وابستگی رکھنے والی تخلیق کار بھی ہیں۔ انھیں پاکستان کی پہلی فارسی رباعی گو شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے، جبکہ خیبر پختونخوا میں خواتین کی سفرنامہ نگاری کے حوالے سے انھیں اولین خاتون سفرنامہ نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ دونوں اعزازات ان کی ادبی شخصیت کے تنوع اور تخلیقی وسعت کی روشن دلیل ہیں۔

ادب کی دنیا میں سفرنامہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں مصنف کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔ سفرنامہ صرف راستوں، شہروں اور مقامات کی تفصیل نہیں ہوتا بل کہ یہ مشاہدے، تجربے، احساس، مطالعے اور تہذیبی شعور کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک کامیاب سفرنامہ نگار اپنے سفر کو اس طرح لفظوں میں ڈھالتا ہے کہ قاری صرف معلومات حاصل نہیں کرتا بل کہ خود بھی اس تجربے کا حصہ بن جاتا ہے۔ قدسیہ قدسی کی سفرنامہ نگاری کا امتیاز بھی ہے کہ ان کے ہاں سفر محض نقل مقام نہیں بلکہ فکر و احساس کی ایک مسلسل حرکت ہے۔

قدسیہ قدسی کی ادبی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی فارسی رباعی گوئی ہے۔ فارسی رباعی صدیوں پر محیط ایک عظیم شعری روایت رکھتی ہے جس میں کم الفاظ میں گہری فکر، فلسفیانہ احساس اور

سید محمد اصغر کاظمی

جمالیاتی اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس صنف میں کامیاب طبع آزمائی شاعر کے وسیع مطالعے، زبان پر عبور اور فکری پختگی کا تقاضا کرتی ہے۔ قدسیہ قدسی نے فارسی رباعی کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر کے یہ ثابت کیا کہ ان کا ادبی شعور صرف ایک زبان یا ایک صنف تک محدود نہیں۔ فارسی زبان سے ان کی وابستگی کلاسیکی ادب کے ساتھ ان کے گہرے رشتے کی عکاس ہے۔

تاہم قدسیہ قدسی کی ادبی شناخت کا سب سے نمایاں حوالہ ان کی سفرنامہ نگاری ہے۔ خیبر پختونخوا کی ادبی تاریخ میں خواتین کی سفرنامہ نگاری کا ذکر ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ انھیں اس خطے کی اولین خاتون سفرنامہ نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے ایسے وقت میں سفرنامہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا جب خواتین کے لیے اس نوع کی ادبی سرگرمیاں نسبتاً کم تھیں۔ ان کی تخلیقی کاوش نے نہ صرف ایک نئی مثال قائم کی بلکہ بعد کی خواتین قلم کاروں کے لیے بھی راستہ ہموار کیا۔

ان کا پہلا اہم سفرنامہ ''گردِ سفر'' (1993ء) ہے۔ یہ کتاب ان کے سفرنامہ نگارانہ مزاج کی پہلی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں سفر کے مشاہدات، مختلف مقامات کی کیفیات اور انسانی زندگی کے متنوع پہلوؤں کو نہایت دل نشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ''گردِ سفر'' کی اہمیت صرف اس کے موضوعات میں نہیں بلکہ اس طرزِ نگارش میں بھی ہے جس کے ذریعے قدسیہ قدسی نے سفر کو ایک ادبی تجربہ بنا دیا۔ وہ جہاں جاتی ہیں وہاں کے مناظر کے ساتھ ساتھ وہاں کے انسانوں، ماحول اور تہذیب کو بھی اپنی نگاہ میں رکھتی ہیں۔

''گردِ سفر'' میں قدسیہ قدسی کی ایک حساس اور باشعور ادیبہ کی شخصیت سامنے آتی ہے۔ وہ راستوں کو صرف آنکھ سے نہیں دیکھتیں بلکہ دل کی گہرائی سے محسوس کرتی ہیں۔ یہی احساس ان کے سفرنامے کو محض روداد سفر سے بلند کر کے ادب کا حصہ بناتا ہے۔

ان کا دوسرا اہم سفرنامہ ''الخلیل والنخیل'' (1998ء) ہے جو حج کے روحانی سفر پر مبنی ہے۔ حج کا سفر ایک مسلمان کے لیے عقیدت، روحانیت اور قلبی کیفیت کا سفر ہوتا ہے۔ قدسیہ قدسی نے اس تجربے کو نہایت احترام، محبت اور ادبی حسن کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس سفرنامے میں مقدس مقامات کی منظرکشی کے ساتھ ساتھ مصنفہ کے قلبی تاثرات بھی نمایاں ہیں۔ وہ ظاہری مناظر کے ساتھ ان کی روحانی معنویت کو بھی محسوس کرتی ہیں، جس سے یہ سفرنامہ ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔

''الخلیل والنخیل'' میں قدسیہ قدسی کا عقیدت مند دل، ادبی شعور اور مشاہداتی نظر ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ یہی امتزاج اس کتاب کو محض سفر کی داستان نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے ایک روحانی تجربے کی ادبی ترجمانی بنا دیتا ہے۔

ان کا تیسرا معروف سفرنامہ ''اخضریں سرزمین'' (2020ء) ہے۔ اس میں بیرونِ ملک سفر کے

تجربات اور مشاہدات شامل ہیں۔ اس کتاب میں قدسیہ قدسی کا تہذیبی شعور مزید پختہ صورت میں سامنے آتا ہے۔ وہ مختلف معاشروں کو ایک کھلے ذہن اور وسیع نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہاں کی ثقافت، رہن سہن، معاشرتی رویوں اور انسانی اقدار کو نہایت باریک بینی سے محسوس کرتی ہیں۔ یہ سفرنامہ ان کے عالمی شعور اور وسیع تجربے کا آئینہ دار ہے۔

قدسیہ قدسی کی سفرنامہ نگاری کا ایک نمایاں وصف ان کی مشاہداتی قوت ہے۔ وہ معمولی واقعات میں بھی معنویت تلاش کر لیتی ہیں۔ کسی شہر کی گلیاں ہوں، کسی تاریخی مقام کی عظمت ہو یا عام انسانوں کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے پہلو، ان کی نظر ہر جگہ ایک خاص معنی تلاش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرناموں میں زندگی کی حقیقی حرارت محسوس ہوتی ہے۔

ان کی منظر نگاری بھی ان کے فن کا اہم وصف ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعے ایسے نقشے بناتی ہیں کہ قاری کے سامنے منظر متحرک ہو جاتا ہے۔ قدرتی حسن، تاریخی آثار اور انسانی معاشرت کے مختلف رنگ ان کی نثر میں ایک خوب صورت تصویر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں جمالیاتی احساس اور حقیقت پسندانہ مشاہدہ ایک ساتھ موجود ہیں۔

قدسیہ قدسی کے اسلوب کی ایک بڑی خوبی ان کی زبان کی شائستگی اور روانی ہے۔ ان کی نثر نہایت متوازن ہے؛ اس میں نہ غیر ضروری تصنع ہے اور نہ بے جا سادگی۔ وہ ایسی زبان اختیار کرتی ہیں جو ادبی وقار بھی رکھتی ہے اور قاری سے براہِ راست رابطہ بھی قائم کرتی ہے۔ یہی وصف ان کے سفرناموں کو دل کش اور موثر بناتا ہے۔

خواتین کی ادبی خدمات کے تناظر میں بھی قدسیہ قدسی کا مقام نہایت اہم ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ خواتین کا تجربہ، مشاہدہ اور احساس ادب کی مختلف اصناف میں ایک منفرد اور مضبوط آواز بن سکتا ہے۔ انھوں نے خیبر پختونخوا میں خواتین کی سفرنامہ نگاری کے لیے ایک بنیاد فراہم کی اور اپنی تخلیقات کے ذریعے اس صنف کو وقار بخشا۔

مختصر یہ کہ قدسیہ قدسی ایک ایسی ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں جنھوں نے فارسی رباعی کی لطیف شعری روایت اور سفرنامہ نگاری کی وسیع دنیا دونوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ پاکستان کی پہلی فارسی رباعی گو شاعرہ اور خیبر پختونخوا کی اولین خاتون سفرنامہ نگار کی حیثیت سے ان کا نام ادبی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ ان کے سفرنامے مشاہدے کی صداقت، احساس کی گہرائی، زبان کی شائستگی اور تہذیبی شعور کا خوب صورت امتزاج ہیں۔ انھوں نے سفر کو صرف راستوں کا بیان نہیں رہنے دیا بلکہ اسے فکر، احساس اور ادب کا زندہ تجربہ بنا دیا۔

☆☆☆☆☆

صوفی کی بزمِ رزم

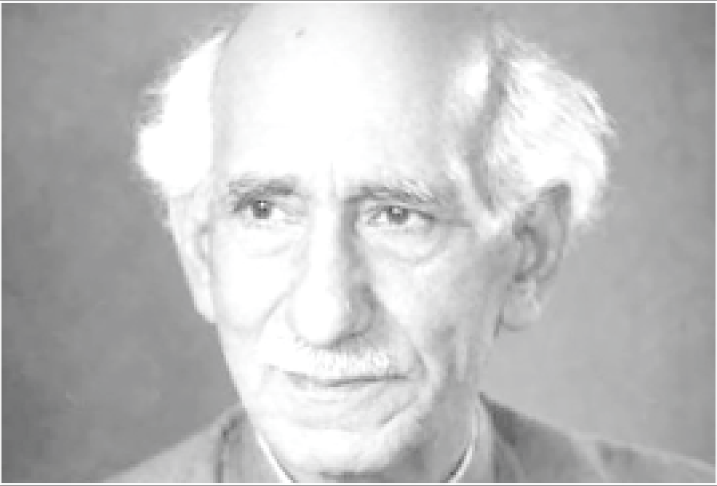

رانا لیاقت علی

جناب جمیل جالبی کے بقول معلوم تاریخ کے پوری دنیا کے سب سے پہلے شاعر ہومر (12-9 ق م؟ نابینا؟) کا تعلق خطۂ یونان سے ہے۔ اس کی تصانیف ایلیڈا اور اوڈیسی کو رزمیہ شاعری مانا جاتا ہے۔ دوسری تحقیق کے مطابق گامش (27 ق م؟) کی کہانی کو اوّلیت حاصل ہے وہ بھی رزمیہ ہی ہے۔ گویا عالمی کینوس پر شاعری کی ابتدا رزمیہ شاعری سے ہوئی۔ یونانی شاعر ورجل (70 ق م) نے رزم نامہ ''اینیڈ'' تخلیق کیا۔ جان ملٹن (1600ء) نے ''پیراڈائز لاسٹ'' سے رزمیہ شاعری کے دامن کو مالا مال کیا۔
ڈکشنری جامع اردو لغات کے مطابق:

''رزم'' اول پر فتح دوم اور سوم ساکن ہیں۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں جنگ معرکہ۔ اس سے مرکب ہے رزم گاہ یعنی میدان جنگ رزمیہ کے معنی ہیں رزم سے نسبت رکھنے والا۔ (1) رزمیہ شاعری موضوعاتی شاعری کی اصطلاح ہے۔ وہ شاعری جس میں کسی قوم، فرد، معاشرے اور تہذیب کے بہادرانہ کارناموں کا اظہار کیا جائے رزمیہ شاعری کہلاتی ہے۔ اس نوع کی شاعری مفہوم اور موضوع کے جزوی اختلاف کے باوصف رزم نامہ حماسہ

ساگا رجز یہ جنگی ترانہ ترانہ وغیرہ نام پاتی ہے- زردو رزمیہ شاعری کے اسلوب میں کئی شامل ہو چکے ہیں جیسے مزاحتی اسلوب شاعری، انقلابی اسلوب شاعری، زندانی اسلوب شاعری وغیرہ - اس کے لیے انگریزی لفظ EPIC ہے- ڈکشنری کے مطابق ایپک کا مطلب ہے "along (n) narrative pome telling of a heroes deeds"

مرثیہ کے تمام اجزا چہرہ سراپا رخصت آمد رجز رزم بین نوحہ سوز خوانی میں رزمیہ عناصر پائے جاتے ہیں- انسانی نفسیات کا خاصا ہے کہ بہادری کے قصے تحیر میں ڈالتے ہیں- شمشیر کی دھنی شیر میسور سلطان فتح علی ٹیپو (1799م) کا ایک ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' زبان زد عام ہے- افلاطون کہتا ہے کہ جوانوں کو اپنے ملک کے لیے بہادری سے مرنا سکھایا جائے اور عاقبت میں صلے کی امید دلائی جائے (2)

برعظیم کی ادبی روایت میں سنسکرت کی نظم ''مہابھارت'' ہے- یہ دنیا کی طویل ترین نظم ہے اور رزمیہ ہے- سنسکرت زبان میں ''رامائن'' بھی رزمیہ شاعری کی عمدہ مثال ہے- فردوسی کے شاہنامہ اور نظامی کے سکندر نامہ کوئی اہل اردو فارسی رزمیہ کے طور پر پہچانتے ہیں-

عبدالحلیم شرر (1869-1926) کی تاریخی ناولوں پر تاریخیت مسخ کرنے کے الزامات سے صرف نظر کیا جائے تو ان ناولوں نے مسلمانوں کو کھویا ہوا ماضی ضرور یاد دلایا- اسی کے غالب اثرات کے نتیجے میں ''مدوجزر اسلام'' تخلیق ہوئی- الطاف حسین حالی (1837_1989) نے کہا ''جب خدا پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لایا میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں'' (3)

حفیظ جالندھری (1900-1980) اردو کی سب سے طویل نظم ''شاہنامہ اسلام'' کے خالق ہیں- یہ بھی رزمیہ نظم ہے- علامہ اقبال (1877-1938) کی شاعری میں شاہین کی علامت انسانی ذہن کو قوت عمل کے لیے تغذیہ فراہم کرتی ہے- اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی نظموں میں رزمیہ شاعری کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں- 'شکوہ' کا بند ملاحظہ کیجیے:

تھے ہمیں ایک تیرے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی
(کلیاتِ اقبال ص 90)

ترقی پسند تحریک کے اہم رہنما احمد ندیم قاسمی (1916-2006) کی نظم کا عنوان "چھ ستمبر" ہے۔ان کا رومانوی اسلوب تحیر انگیز ہے۔

پہلا بند:

چاند اس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود
اتنا خوں رنگ تھا جیسے کسی معصوم کی لاش
تارے اس رات بھی چمکے تھے مگر اس ڈھب سے
جیسے کٹ جائے کوئی جسم حسیں قاش بہ قاش
اتنی بے چین تھی اس رات مہک پھولوں کی
جیسے ماں، جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش

....

اسی نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو جس میں رزمیہ شاعری اپنے عروج پر ہے:

آخری بار اندھیرے کے پجاری سن لیں
میں سحر ہوں، اجالا ہوں حقیقت ہوں میں
میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
اور اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں

میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں، افلاک کی دہشت ہوں میں
(نقوش ماہنامہ (کراچی ص 365)

جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، یوسف ظفر، فیض احمد فیض، اسرار حق مجاز، ساحر لدھیانوی، حبیب جالب، عبدالعزیز خالد، رئیس احمد جعفری، اور محسن نقوی کی شاعری میں رزمیہ عناصر کو بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم (1899-1978) غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کی شہرت کا مدار جنگی ترانوں اور بچوں کی نظموں پر ہے۔ صوفی تبسم کی غزل ایک پختہ شعور کے شستہ اظہار پر مشتمل ہے اسے سماجی فکر کی نمائندہ غزل کہا جا سکتا ہے۔ ان کی رزمیہ شاعری کے جوہر ان کی نغمہ نگاری میں کھلتے ہیں۔ جب وہ قوم کے ایک ایک فرد کی انگلی پکڑ کر ہمت اور حوصلے کی گلی تک لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عرفان پاشا رقم کرتے ہیں "صوفی تبسم کی شاعرانہ حیثیت میں ایک بہت بڑا مقام ان کے ملی ترانوں کو حاصل ہے، جو انھوں نے 1955 اور 1971 کی پاک بھارت جنگوں کے دوران لکھے"(4)

ہمت میں ملا کرتی ہیں مشکل کو پناہیں
ہمت سے کھلا کرتی ہیں تدبیر کی راہیں
ہمت سے پلٹ جاتا ہے تقدیر کا دھارا
ہمت کے شناور کو بھنور بھی ہے کنارا
(کلیاتِ صوفی تبسم ص 336)

صوفی تبسم دراصل قوم کے افراد کو تفویض

قرض اور ادائی قرض کی بازیافت کروانا چاہتے ہیں۔ وہ قرض جو ملت نے تفویض جو اجداد کی قربانیوں سے واجب ہوا۔ مختار مسعود نے کہا تھا ''جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے، جس آبادی میں اہل احسان نہ ہوں اسے جانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس تمدن کو اہل جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں وہ خوش نما اور دیرپا نہیں ہوتا''(5)

کلیات صوفی تبسم مرتبہ صوفی گلزار احمد کے مطابق صوفی تبسم کی اردو شاعری میں 17 رزمیہ منظومات اور نغمے ہیں اور پنجابی زبان میں 12 رزمیہ اور گیت ہیں ان پر کامل رزمیہ شاعری کا اطلاق ہوتا ہے۔ دیگر شاعری میں بھی ایسی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کا رزمیہ شاعری میں ایک انوکھی کشش ہے۔ نظم خوانی کے دوران دل خود بخود آمادہ عمل ہو جاتا ہے۔ کرسٹوفر کاڈویل نے کہا تھا ''جس طرح اوزار ہاتھوں کو نئے نئے کاموں کے لیے تیار کرتے ہیں اسی طرح شاعری دل کو نئے نئے مقاصد کے لیے آمدہ کرتی ہے''(6)

علامہ اقبال نے امید و رجا کا پیغام دیا اور قوم کو آمادہ عمل کر کے ہر فرد کو ملت کا ستارہ قرار دیا۔ صوفی تبسم فرد کو ملت کی آن، بان، شان کی محافظت پر مامور کرتے ہیں اور اسے ہمت بکف کر کے محاذ پر روانہ کرتے ہیں:

ہر فرد ہے اس ملک کی عزت کا محافظ
ہر فرد ہے اس ملک کی عظمت کا محافظ
ہر فرد ہے اس ملک کی قسمت کا ستارا
ہمت کے شناور کو بھنور بھی ہے کنارا

(کلیات صوفی تبسم ص337)

صوفی تبسم کی بزم رزم میں وقار اور رکھ رکھاؤ ہے لیکن جب وطن کی پکار ہو تو صوفی کا قلم للکار بن جاتا ہے۔ اور غنیم کی اڑائی ہوئی دھول شانت ہو جاتی ہے:

ہم پرچم آزادی لہراتے ہوئے آئے
طوفان کی لہروں کو شرماتے ہوئے آئے
سنگین چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے آئے
وہ دیکھنا دشمن پر
پھر خوف سا طاری ہے
اب جیت ہماری ہے
ہر سمت بڑھیں فوجیں ہر سمت قدم اُٹھے
وہ بیٹھ گئے دشمن میدان میں ہم اٹھے
وہ ظلم نے دم توڑا وہ جور و ستم اٹھے
اب عدل کا دور آیا
اب عدل کی باری ہے
اب جیت ہماری ہے

(کلیات صوفی تبسم ص364)

جب 1965 میں وطن عزیز کو خاک اور خون میں نہلا دینے کی سعی ناروا کی گئی تو اس وقت پاکستان کا ہر باسی جاں باز سپاہی بن گیا اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر داد شجاعت دینے پر آمادہ ہو گیا- غنیم کی طرف سے آگ مسلسل بھڑکائی جا رہی تھی- کشمیر کے مسئلے کو لے کر پاکستان کے وجود پر ہی کاری ضرب لگائی جاتی تھی- اس صورت حال کو بھانپ کر معروف مغربی سکالر برٹرینڈ رسل (پ 1872) نے خطے کو وارننگ دی اور اقوام عالم کے موقف کی یاد دہانی کروائی-

"ایشیا میں بڑی جنگ ہو گی ضروری ہے کہ استصواب رائے کرایا جائے کہ کشمیری ہندوستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ- (7)

مسئلہ کشمیر کا حل تو امن کا راستہ ہے لیکن غنیم اگر امن پر آمادہ نہ ہو بل کہ بر سر پیکار ہونا چاہیے-

جنگ لازم ہو تو لشکر نہیں دیکھے جاتے-

(شاعر: معراج فیض) کے مصداق پھر صوفی تبسم کے سپاہی صف شکن دندان شکن جواب آں غزل کے لیے حاضر باش ہوتے ہیں:

یہ ہواؤں کے مسافر، یہ سمندروں کے راہی
میرے سر بکف مجاہد، میرے صف شکن سپاہی
یہ تیرا یقین محکم تیری ہمتوں کی جاں ہے
تو راہ تو ہی منزل تو میر کارواں ہے

....

تو وطن کا پاسباں ہے تیرے ہاتھ میں ہے شاہی
میرے سر بکف مجاہد، میرے صف شکن سپاہی
(کلیات صوفی تبسم ص 373)

بڑھے چلو بڑھے چلو بڑھے چلو
سپاہیو بڑھے چلو
بہادرو! بڑھے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو بڑھے چلو
یہی تمھاری شان ہے
اسی میں ساری آن ہے
یہی عمل کی جان ہے
بڑھے چلو بڑھے چلو بڑھے چلو
(کلیات صوفی تبسم ص 368)

صوفی تبسم صادق جذبوں کی لگن کے شاعر ہیں- ان کا قلم جذبوں کی روشنائی سے نکھر کر رعنائیاں بکھیرتا ہے- جہاں پر جذبوں کی صداقت اردو کے قالب میں ڈھل کر روشنی بکھیری ہے وہیں یہ پنجابی میں ماحول کو چاروں اور سے فانوس بنا دیتی ہے- پنجابی کی نظم بعنوان "قائداعظم" ملاحظہ کریں-

دشمن تیرے چار چوفیرے
کلّی تیری جان

باطل دے لکھ گھسن گھیرے
حق دا اک ایمان
حق دا اک ایمان
(کلیات صوفی تبسم ص 523)

مشہور شاعر اصغر سودائی (1925-2008) کے ایک ہی رزمیہ نغمے نے پاکستان کا پیغام گھر گھر، گلی گلی، نگر نگر، شہر شہر، بل کہ برعظیم ہر کونے میں پہنچا دیا۔ قائداعظم کے تحسین سے بھرپور الفاظ کی بے بدل کے مستحق ٹھہرے کہ تحریک پاکستان میں ان کا حصہ 25 فیصد ہے(8) اس امر کی تصدیق میں کوئی شبہ مانع نہیں کہ تشکیل پاکستان کی رزمیہ شاعری کا ہاتھ ہے۔

پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ
شب ظلمت میں گزاری ہے
اُٹھ وقت بے داری ہے
جنگ شجاعت جاری ہے
آتش و آہن سے لڑ جا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

(حوالہ ایضا)

صوفی تبسم آزادی پاکستان کے وکیل ہیں۔ تحریک پاکستان میں رزم کا جو میدان سجا اس میں کانگریس (موسسہ 1885) نبرد آزما تھیں۔ مسلم لیگ کامل آزادی کی خواہاں اور کانگریس حکمرانوں کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھی اور ''ڈومینین آزادی'' تک کو قبول کرنے پر بھی آمادہ تھی۔ صوفی تبسم شاعری کے خواب (تصور پاکستان) کی باریکیوں سے آگاہ تھے کیوں کہ آپ براہ راست مجالس اقبال سے فیض یافتہ تھے۔ آپ نے کامل آزادی کے حق میں جو نعرۂ مستانہ لگایا اس میں دانش اقبال کا فیض جھلکتا ہے۔

لاکھ مصیبت ایک سلجھاؤ
لاکھ بگاڑ ایک بناؤ
لاکھ دکھوں کا ایک علاج
اپنے دیس میں اپنا راج
خود بگڑنا خود ہی سنورنا
اپنے بل پر آپ ابھرنا
اپنے ہاتھ اپنی لاج
اپنے دیس میں اپنا راج
(کلیات صوفی تبسم ص328)

آپ جہاں آزادی کے وکیل ہیں وہاں آزادی کی حفاظت کے کفیل بھی ہیں:

جہاں دشمن نے سر اپنا اُٹھایا
کہیں سے قدم آگے بڑھایا
وہیں ہم نے کیا اس کا صفایا
بلا کا ہے ہمارا توپ خانہ

کبھی جب ہوش میں آتے ہیں ہم لوگ
تو رعدو برق بن جاتے ہیں ہم لوگ
عدو پر آگ برساتے ہیں ہم لوگ
قیامت ہے ہمارا توپ خانہ
(کلیات صوفی تبسم ص 374)

صوفی تبسم کے پنجابی رزمیہ نغموں نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں- 23 مارچ، 14 اگست، 6 ستمبر، 7 ستمبر، 9 نومبر، 25 دسمبر، غرض کوئی بھی قومی تہوار ہو صوفی تبسم کے نغمے قومی فضاؤں میں تیرتے ہوئے سماعتوں میں رس گھولتے ہیں- تلمیذ تبسم محمد سلیم چغتائی ایک مضمون میں رقم طراز ہیں" 1965 کی جنگ میں انھوں نے پنجابی رزمیہ ترانوں کو بام عروج تک پہنچایا - ان کو پنجابی رزمیہ ترانوں کا موجد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا" (9) آواز، آہنگ اور ترنم سے مزین کرنے میں نسیم بیگم، ناہید اختر، فریدہ خانم اور ملکۂ ترنم نور جہاں کے سروں نے جادو جگایا ہے-

ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں وکدی
کیہہ لبھنی ایں وچ بازار کڑے

ایہہ دین میرے داتا دی
نہ اوئیں ٹکرا مار کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں لبھدے
کیہہ لبھنی وچ بازار کڑے

....

اے پتر وکاؤ چیز نہیں
مل دے کے جھولی پائیے نی
ایہ ایڈا سستا مال نہیں
کتوں جا کے منگ لیائیے نی
ایہ سودا نقد وی نہیں ملدا
توں لبھدی پھریں ادھار کڑے
کیہہ لبھنی ایں وچ بازار کڑے

اے شیر بہادر غازی نیں
ایہ کسے کرلوں وی ہردے نہیں
انہاں دشمناں کولوں کیہ ڈرنا
اے موت کولوں وی ڈردے نہیں
ایہ اپنے دیس دی عزت توں
جان اپنی دیندے وار کڑے
کیہہ لبھنی ایں وچ بازار کڑے
(کلیات صوفی تبسم ص617)

پنجابی زبان کی ایک صنف 'ماہیا' ہے- ماہیا لفظ ماہی سے نکلا ہے عاشق اور محبوب دونوں ہی ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں اس لیے اسے ماہیا کہتے ہیں- صوفی تبسم نے پنجابی کے ماہیا کو اپنا "سپاہیا" قرار دے کر کیا خوب رنگوں کی گل کاری

کی ہے:

کیہا سوہنا سوہنا وسنا ایں وے سپاہیا
سانوں چن وانگوں وسنا ایں وے سپاہیا

جدوں وچ میدان اج جاویں ماہیا
تو پاں ٹینکاں دے نال جاویں ماہیا
اڑ جاویں ماہیا "لڑ جاویں ماہیا
(کلیات صوفی تبسم ص512)

پنجابی زبان و ادب میں "ڈھول" ایک معروف علامت ہے۔ اس کا اطلاق پیارے، پتم، جانم، خوش ادا، خوش اندام، خوش طرز محبوب پر ہوتا ہے۔ محاذ جنگ پر برسرپیکار 'سپاہی' کے لیے پوری قوم کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں دعائیں کرتی ہیں۔ ہم سب ایک کنبہ بن کر دعا:

میریا ڈھول سپاہیا
تینوں رب دیاں رکھاں

اج تکدیاں تینوں
سارے جگ دیاں اکھاں
میریا ڈھول سپاہیا
تینوں رب دیاں رکھاں

جدھر نظراں پاویں
ویری مار نساویں
جنہاں راہواں توں جاویں
جنہاں راہوں تو جاویں
اوہناں راہواں دی مٹی
میریاں چمن اکھاں
تینوں رب دیاں رکھاں
(کلیات صوفی تبسم ص609)

صوفی تبسم کی رزمیہ شاعری میں ہماری بقا کا راز پنہاں ہے۔ اس لیے ہماری آنے والی نسلیں بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ معروف مفکر فلپ سڈنی نے کہا تھا "Each excillent thing] once learnd] serves for a measure of time" (10)

ہم شکر گزار ہیں محسنین کو یاد رکھنے کے لیے۔ امسال 23 مارچ 2023) صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان نے صوفی تبسم کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں نشانِ امتیاز (بعد از وفات) سے نوازا۔ یہ ایوارڈ ان کی قابل فخر پوتی عفت آب ڈاکٹر فوزیہ تبسم (معروف کیمیائی سائنسدان، شاعر، کالم نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، براڈ کاسٹر، معلم) نے صدر پاکستان سے وصول کیا۔

☆☆☆☆☆

عباس کا فخر......فخر عباس

زندگی کے اس میلے میں آپ کو کچھ لوگ ایسے ملتے ہیں جن سے آپ کا کوئی خون کا رشتہ نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی آپ ان کے ساتھ روحانی تعلق محسوس کرتے ہیں۔
ڈاکٹر فخر عباس بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔
میری پہلی ملاقات ڈاکٹر صاحب سے ہمارے گھر ہی ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر صغیر احمد صغیر کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ میں ڈاکٹر فخر عباس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ ان کا لہجہ دھیما اور سلجھا ہوا تھا۔ گفتگو کا انداز بھی بے حد مودبانہ تھا۔
فخر سے پہلی ملاقات کے بعد ہی میں سوچنے لگی کہ ان کے والدین کتنے خوش نصیب ہیں جو ایسا ہیرے جیسا بیٹا ملا ہے۔ اس محفل میں انھوں نے نعت مبارکہ خوش الحانی سے پیش کی بعد ازاں اپنا کلام بھی سنایا۔
میں کسی بھی مرد سے اسی صورت متاثر ہو سکتی ہوں اگر اس کا کردار بہت اعلیٰ ہو۔ ڈاکٹر فخر کردار کی عظمتوں پر فائز تھا۔ اس کے انداز میں بے باکی نہیں تھی......بل کہ بلا کی شائستگی شامل تھی۔
تھوڑے عرصے بعد ہی میں نے گھر پر ایک گیٹ ٹو گیدر کا اہتمام کیا جس میں ڈاکٹر فخر عباس اور ڈاکٹر صغیر کو مدعو کیا۔ برنچ کے بعد ہی ہم سب لوگ والد گرامی پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کے ہمراہ شہر ساہیوال کے دورے پر نکل گئے۔
ساہیوال کی اہم جگہیں گھومنے کے بعد ہم نے گورنمنٹ کالج ساہیوال میں کچھ دیر پڑاؤ کیا۔
اس کے بعد گھر واپسی پر چائے کا دور چلا۔ یہ محفل بھی بہت یادگار ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر فخر سے دوران گفتگو بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ جس کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔
غالباً اس ملاقات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ میڈیکل کالج ساہیوال میں اردو کے حوالے سے محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں مجھے اور والد صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر فخر عباس کو اس مشاعرے میں بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا میں نے فون تھمایا اور ڈاکٹر صاحب کو گھر آنے کی دعوت دے ڈالی جس کو انھوں نے فوری قبول کیا۔
شام سے کچھ دیر پہلے ڈاکٹر صاحب ہمارے غریب خانے پر تشریف لے آئے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ کچھ مزید احباب بھی تشریف لے آئے اور خوب محفل جمی۔ بعد ازاں میں، والد صاحب اور ڈاکٹر فخر میڈیکل کالج

سیدہ آمنہ ریاض

تقریب میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔
جہاں ڈاکٹر فخر نے نہایت عمدہ شاعری سنا کر محفل لوٹ لی اور ڈھیروں داد وصول کی۔
پچھلے دنوں کسی تقریب کے سلسلے میں مجھے آرٹس کونسل ساہیوال میں مدعو کیا گیا۔ جہاں غالباً کسی مشاعرے کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی۔ منتظمین نے مجھ سے لاہور سے کسی شاعر کو مدعو کرنے کے بارے میں پوچھا تو میں نے جھٹ فخر عباس کا نام لے دیا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ موت فخر عباس کے پاس ہی منڈلا رہی تھی۔
فیس بک سکرول کرتے کرتے اچانک خبر ملی کی ڈاکٹر فخر بہت علیل ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی دل بہت پریشان ہوا۔ ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے کے لیے ان کا نمبر ملایا جو ان کے بڑے بیٹے نے اٹھایا اور کہنے لگا کہ بس آپ دعا کریں حالات تشویش ناک ہیں۔ والد صاحب بھی یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوئے اور ان (ڈاکٹر فخر عباس) کی صحت وتندرستی کی دعائیں مانگنے لگے۔
اس سے اگلے ہی دن میں نے موبائل اٹھایا تو قیامت خیز خبر دیکھنے کو ملی کہ فخر عباس اب اس دنیا میں نہیں رہے۔۔
خبر پڑھتے ہی بے اختیار میرے منہ سے نکلا what----
اور میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔۔ مجھے لگا مجھے سانس نہیں آ رہا۔۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ موبائل کی سکرین پر گرنے لگے۔۔ مجھے یک دم صدمہ لگا دوڑ کر والد صاحب کے پاس پہنچی۔ میری آواز جیسے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔۔۔ ابو۔۔۔ ڈاکٹر فخر۔۔۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی۔۔۔ والد صاحب نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا اور روہانسی آواز میں بولے۔۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔۔
اُف..... کیسا پیارا انسان تھا..... پُرکشش شخصیت ..... متاثر کن انداز..... بلا کی ذہانت کا حامل..... سنبھلے ہوئے کردار کا مالک۔۔۔ اتنی جلدی رخصت ہو جائے گا..... یہ کب سوچا تھا؟؟؟.....
ہاں..... بالکل سب نے ایک دن جانا ہے..... لیکن کچھ لوگوں کا جانا ناقابل یقین ہوتا ہے۔۔۔ فخر عباس پاکیزہ روح کا مالک تھا..... وہ ہیرا تھا..... اور ہیرے جیسی روحوں کا قدر دان صرف اور صرف اللہ پاک ہی ہوا کرتا ہے..... اسی لیے اس فرشتہ صفت انسان کو جلد اپنے پاس بلا لیا..... لیکن پیچھے والوں کے لیے نہ ختم ہونے والا صدمہ چھوڑ گیا.....
فخر کا ضرب المثل بن جانے والا شعر

یہ جو لاہور سے محبت ہے
یہ کسی اور سے محبت ہے

....

دراصل اس کی حیات جاوداں کا باعث بن گیا۔ فخر واقعی لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھا۔ جو عباس کا فخر ہو وہ کیسے عزتوں سے محروم رہ سکتا ہے؟
بہرحال دل بوجھل ہے۔۔۔۔۔ اسی بوجھل دل کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک فخر عباس کی اگلی منازل آسان اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔۔۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

تعبیر ہندسہ نہیں: ایک پڑھت

جمیل احمد عدیل کو اس دنیا میں لکھنے پڑھنے کی تاحیات سزا دے کر بھیجا گیا ہے__ میں ڈاکٹر ریاض قدیر صاحب کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں___ 'جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی': ایک جائزہ رقم کرتے ہوئے مصنف نے بہت مدلل انداز میں حمید شاہد صاحب کی بابت لکھا ہے، جسے رد نہیں کیا جا سکتا بلکہ جو ریڈنگ خود مہیا کرتے ہیں وہ متخیلہ کے جہان کی وسعت کو اور بڑھا دیتی ہے اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ حمید شاہد کے ساتھ تہنیتی رشتہ استوار کر لیا گیا ہے۔ محسوسات کی حیات کا فہم بہت عمدہ بنا کر پیش کیا ہے اور ان کے جائزہ نے کیتھیڈرل کے لحاتی افتراق کا پل بھی ایک ہی جست میں عبور کرا دیا ہے۔ یہ بھی کہنا ہے؛ بین المتونیت نے focalisation کے معاملہ کو زیادہ مبہم اور پیچیدہ کر دیا ہے کہ ایک سابقہ متن بھی اس نئے تجربے کی تشکیل میں پیوست ہو جاتا ہے؛ جہاں فکشن میں واقعہ کے بجائے زاویہ ادراک معنی کا تعین کرتا ہے اور کردار کا شعور اسے معنی دیتا ہے۔ نیز جہاں حمید شاہد قاری کو interpretive participant بناتے ہیں وہیں جمیل احمد عدیل اس Interpretation کے عمل کو تنقیدی جہت سے گزار کر قاری کے اخلاقی انحطاط کی سطح کو کم کر دیتے ہیں۔ یوں ایک داخلی کیفیت احساسات کی حیات کو دوام بخشتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر صاحب نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ اب وہی افسانہ ممکن حد تک اپنا نقش مرتسم کر پائے گا جو پامال جادے سے عمداً گریزاں ہو۔ زبان ہی انسان کی اصل پہچان ہے۔ وہ زینت، ضرورت اور سہولت کی خاطر switch ضرور کرتا ہے لیکن

محمد اکرم

خوشی اور تکلیف کے احساس کے اظہار کی زبان ہمیشہ مادری زبان ہی قرار پائی ہے۔ فاطمہ کی حالت زار اپنے confession سے سوا نہیں ہے۔ جب انسان کے گرد روشنیوں کا ہالہ اپنی گرفت کمزور کر دیتا ہے تو اندر کا تعفن باہر نکلنے لگ جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے ہاں قاری کو اپنی تطہیر اور تزکیے کا موقع فراہم نہیں ملتا بلکہ اسے اپنے احساس جرم میں جتلا کر کے اس کی agony کو بڑھا دیتا ہے۔ پروشاسی، کروفر اور فروشاسی کی تعبیر قطعاً ہندسہ نہیں کیونکہ ہر مطالعہ اس کی نئی تعبیر تراشتا ہے۔ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہی نظام کی خرابی کو آشکار کرتے ہیں پھر چاہے کوئی نیا سورج تراش کر ہی ان کی ستائش باہمی ہو۔ جمیل احمد عدیل صاحب نے جتنی مہارت سے عبارت کو مقتبس راستہ دے کر عورت کی productivity کو ارفع مقام دیا ہے۔ اس شعر پر ختم کروں گا:

سلجھا کر اپنی زلف کو وہ مطمئن ہیں یوں
جیسے کوئی جہان میں پریشان نہیں رہا

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی بلاشبہ ایک فکر انگیز معاصر نقاد ہیں۔ معاصریت کا لفظ بہت سرعت کے ساتھ اپنے معنی کی جہتوں میں تغیر پذیر ہو رہا ہے۔ ترقی پسندوں کی رجعت پسندی آج بھی معاصر ادب کو نشان زد کیے ہوئے ہے۔ یہ بھی ایک کڑوا سچ ہے کہ شخصیت پرستی سے لے کر عقیدہ پرستی تک ہم باقی حیات اس زعم کے دفاع میں کھپا دیتے ہیں: two wrongs dont make a right- جس خوب صورتی سے جناب جمیل احمد عدیل نے ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی صاحب کی تنقید کو قلمبند کیا ہے، بہت خوب کیا ہے لیکن ایک جملہ عرض ہے کہ تخلیق کار کا اپنا ذہن ہوتا ہے اور نقاد کا اپنا۔

جمیل احمد عدیل صاحب کا اسلوب سیاق کے منظرنامے میں سمجھنا بھی ایک کٹھن مرحلہ سر کرنے جیسا ہے۔ بلاشبہ بہترین سلیقے سے دلکش تحریر کے مفہوم میں پیوست ہو جاتا ہے۔ خالد فیاض کی نظری منزل اشتباہ کا شکار نہیں۔ Glossographer مصنف کی اصطلاح بہت ہی خوبصورت استعمال کی ہے۔ سیفو کی شاعری کا تناظر عمدہ بیان ہوا ہے۔ سچ واقعتاً ایک relative ٹرم ہے جو یقیناً ہر ایک کو اپنے تشکیکی لہجے سے مبرا لگتا ہے کیونکہ سچائی ایک مکمل پیکج کے ساتھ سچائی ہے۔ تقویم و بے فیض مراقبہ جیسے الفاظ خوانندہ کی تفہیم کو نقاد سے جوڑ دیتے ہیں جو تفہیم طبع کے ساتھ

ساتھ علمی علویت کا پرچار بھی کرتے ہیں۔

انکشافات کا عمل واقعی نہیں تھمنا۔ بے شک اے آئی (AI) کے استعمال نے جام جم اور جام سفال کا فاصلہ کافی سمیٹ دیا ہے لیکن اس کا حسن استعمال اور سوئے استعمال فرق ضرور ڈالے گا۔ ایک دور میں جب کمپیوٹر آیا تھا تب بھی شاید عقل انسانی کے بخیلوں کو اپنی اہمیت اور کم مائیگی کے احساس نے آ جکڑا تھا، آج بھی مصنوعی ذہانت سے وہ خوفزدہ ہے جو تغیر کے ثبات سے شاکی ہے۔

عصری حسیت کو جتنا بھی منہا کر گزریں تغیر زمانہ ثقافتی اقدار و روایات کا عکس دھندلا نہیں پائے گا کیونکہ بلاشبہ انسان کا علمی شعور ثقافتی اور معاشرتی اقدار کے زیر سایہ تشکیل پاتا ہے۔

اصل میں ثقافتی اقدار ہی تخلیقی محرک کو impetus مہیا کرتی ہیں۔ مزاحمتی تحریریں ہی مفاہمتی مفہوم کے لیے راستہ ہموار کرتی ہیں اور دھرم سنکٹ سے پہلو تہی ممکن نہیں، کسی نہ کسی صورت معاشرتی آداب کے تابع بھی مذہبی مشق جاری رہتی ہے۔ مذہب سماج کے معاملات کی تفہیم کو پیچیدہ ہونے سے روکنے کا کام بھی کرتا ہے، جہاں لاشعور میں پنہاں کوئی تکلیف جاگی وہیں مذہب کی قربت نے بچھا رکھ کر اس کو سکون بہم پہنچانا چاہا لیکن ڈیجیٹل ایرا کے حاصلات سے انکار نہیں مگر ماسوا معاشرتی disorder تا دم تازہ کوئی مثبت اقدار کا حامل نہیں قرار پا سکا کیونکہ معاصر نسل تو فطرتاً عجلت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ تغیر پسندی کی بھی دلدادہ ہے۔ دھیمی رفتار سے تبدلات جذب ضرور ہوں گے مگر واضح رہے اب فی زمانہ یہ تبدلات و تغیرات رفتار پکڑ چکے ہیں۔ معاصر ادبا کا جدت کے ساتھ مصنوعی ذہانت اور ڈیجیٹل ایرا سے فکری انسلاک باہم مربوط ہے۔

'پیار کا پہلا شہر' کی تفہیم کو جمیل صاحب نے اپنے منفرد اسلوب سے مزید سہل کر دیا ہے کہ قاری اساس مطالعہ خود ہی قاری اساس تنقید کا منظر بھی پیش کرتا ہے کیونکہ محبت کا اظہار سطحی جذباتیت سے بڑھ کر ایک نفسیاتی وجودی احساس کا مظہر بن گیا ہے، جو اس رومانوی واردات کا بیانیہ ہی الگ بنا دیتا ہے۔

جمیل احمد عدیل نے عطاء الحق قاسمی صاحب جیسے ہمہ جہت ادیب کو بجا طور پر: ''ہے قاسمی بجائے خود اک محشر خیال'' ! لکھا ہے۔ وہ انسان کی تحقیر و تضحیک کی بجائے سچوایشن کے تضاد کو واضح کرتے ہیں۔ ان کے نفسیاتی رویوں کی جزئیات ان کی تخلیقی قوت کی برجستگی میں مضمر ہے۔

جہاں تک ''تعبیر ہندسہ نہیں'' سے موسوم اس تنقیدی مضامین کی کتاب کا تعلق ہے تو جہاں علمی

بصیرت میسر آئی وہیں اس کے ساتھ ساتھ تفریحِ طبع کے مواقع بھی میسر آئے۔ اس ضمن میں مصنف کے ایک مضمون کا حوالہ دیا جائے گا، جو انھوں نے اعجاز روشن کے نمائندہ افسانے: 'ساڑھے چار فٹ' کے بارے میں لکھا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اعجاز روشن ایک معاصر زندگی کا بڑی مغائرت کے ساتھ مشاہداتی شعور عطا کرتے ہیں۔ ہر آن ایک تازہ نشاط کی طلب لاحق رہتی ہے۔ بلا مباحثہ فرد کی متعین شکل ہی پیمانہ قبولیت کی سند ٹھہری اور ہونیت کے عذاب سے مفر قطعی طور پر ممکن نہیں:

اپنی قسمت سے ہے مفر کس کو
تیر پر اڑ کر نشانے لگے

....

قیوم صبا صاحب کا شعری اثاثہ واقعتاً ایک رخی کے سقم سے منزہ ملے گا۔ ان کے ہاں مدحت و عقیدت ایک دوسرے میں ضم ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم لاریب ایک سریع الرفتار قلم کار رہے ہیں۔ اشفاق رشید کے بارے پڑھ کر بہت ہی مزہ آیا کیونکہ جناب جمیل احمد عدیل کے مزاج سے کچھ کچھ شناسائی ہے۔ مجھے وہ دور یاد آگیا جب غالباً 2013 میں ان کی لاہور ٹرانسفر ہوئی تو شعبہ اردو سے وابستہ پروفیسر جاوید اقبال صاحب نے لاہور کے دوستوں کو باقاعدہ مطلع کیا کہ جناب جمیل احمد عدیل ایک بہت ہی ملنسار اور عوامی سطح کے استاد ہیں، تو جس جس دوست کو میسر آئیں ان سے گلے ضرور ملیے گا۔ باقی کے معاملات جمیل احمد عدیل خود جانتے ہیں۔

ابدال بیلا سے مصنف کے بے تکلف تعلق پر بے حد طمانیت کا احساس ہو رہا ہے۔ ان کی تحریروں میں تصوف کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ ہمیں اس بھید بھیتر کو unfold کرنے میں کبھی دلچسپی نہیں رہی جبکہ ان کے نروان سے اس عاجز سمیت بہت لوگ فیض یاب ہوئے ہیں۔ نروان کا مطالعہ ایک بڑی لطیف کیفیت کا احساس دلاتا ہے۔

ڈاکٹر عذرا لیاقت کے کے ترک وطن کے اظہار کا اچھوتا خیال اور ڈاکٹر محمد نصر اللہ کی نفسیاتی حقیقت نگاری کو بڑے منفرد انداز میں قلمبند کیا گیا ہے۔ اس بات پر بہت نشاط انگیز حسیت ہوئی کہ جسے بوجوہ ایمان عزیز ہے، وہ کوچہ الحاد میں قدم زنی سے گریز کرے کیونکہ خوامخواہ احساس زیاں نہ جاتا رہے۔ جب مذہبی practice سے احساس گہرا ہو جائے کہ مذہب ضامن ہے تو مان لیجیے کہ روحانی اطمینان کا یہ عارضہ عارضی نہیں۔

فضل حسین قیصر کو جواب دیتے ہیں کہ پرانے لوگ جتنے مرضی نئے تقاضے کر لیں لیکن یہ درست ہے کہ افسردگی کا منبع تنہائی نہیں بوریت و یکسانیت ہے۔

جس کو طبی حوالے سے مشورہ لائف سٹائل بدلنے کا دیا جاتا ہے۔ میں جمیل احمد عدیل صاحب کی اس بات سے صدفی صد متفق ہوں کہ جب تک سینے میں سانس کی دستک جاری ہے قنوطی ہوئے بنا زندہ رہنا چاہیے۔

دھیان کو نوری شجر کہیے اور نوید شہزاد کو اس شجر کا باغبان۔ حامد یزدانی نے تھوڑی آزادی کو زیادہ استعمال کر کے اپنا نام معاصر فکشن میں بنایا ہے۔ کہانی تفریق کیے بنا ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ نمایاں ہیں اور سلمیٰ صنم سبک سے وابستہ کسی جہت پر واقعی سمجھوتے کی قائل نہیں۔ ڈاکٹر صنوبر الطاف نے فکشن کو امکانی طور پر منور کیا ہے۔ حمزہ ہاشمی کی نسبت سے نقش نگاراں کی تعمیر اور عزم تازہ کے مضمون کو بہت عمدہ لحاظ سے تخلیق کیا ہے۔ زویا حسن کی نئی آواز نے اردو افسانے میں اپنا مقام بنا لیا ہے اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک حقیقتاً ایک مجسم تخلیقی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر کاشف فراز کا علمی مقام اور ان کی رعایت سے کوانٹم میکینکس ان کی ذات و شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ زوبیہ انور کی تانیثی عکس ذات بہت عمدہ پیرائے میں ڈسکس ہوئی ہے۔ قومی ترانے کی تفہیم پر انجم رحمانی کے افکار و خیالات کسی صورت مبہم نہیں بلکہ وہ تاثراتی اظہار کے myth کو بھی چیلنج کرتے نظر آتے ہیں۔ خالد جاوید بجا طور کہیں اپنے امیج کی پرورش میں منہمک دکھائی نہیں دیتے۔

گماں سے پرے ہی حقیقت آشکار ہوتی ہے جہاں ڈاکٹر حمیرا جبیں نے بڑے لطیف پیرائے میں کہیں بھی ماتم کناں ہوئے بغیر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر انعام برنی نے جو لکھنا چاہا اس کی جرأت اپنے تصور سے معدوم نہیں ہونے دی اور جمال الدین خان نے اپنے انداز رو و اسے دعائیں سمیٹی ہیں۔

جناب جمیل احمد عدیل کا اسلوب بہت عالمانہ ہے اور بہت ساری جگہوں پر انگریزی الفاظ کی اردو نقل حرفی بھی قاری کو چوکنا کیے رکھتی ہے۔ 'تعبیر ہندسہ نہیں' میں انہوں نے بڑے باکمال انداز میں شخصیت اور اس کے فکری وفنی ارتقا کو بہت ہی منتظم انداز میں تفہیم دی ہے۔ ان کی تنقید میں تاثراتی و موضوعاتی نہیں بلکہ تجریدی عناصر کا غلبہ زیادہ ہے۔ معاصر ادب کی تفہیم میں قطعیت کے امکانات کو یکسر رد کر کے کثیر المعنویت کے کانسیپٹ کو پیش کرتے ہیں جس سے ان کا جمالیاتی ذوق ایک فکری استعارے کی صورت ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وہ ماتن اور متن کے رشتہ ہائے باہمی آہنگ کو تغیر کی صورت تعبیر کرتے ہیں جس سے ان کا تنقیدی شعور ان کی تخلیقی و تنقیدی صفات کا اجمالی امتزاج بن جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

نادیہ عنبر لودھی کا ناول خاک دان

نادیہ عنبر لودھی نے یہ ناول اپنے بیٹوں ہادی اور ولی کے نام انتساب کیا ہے۔

وہ ناول کے آغاز میں ''زندگی درد کا صحیفہ ہے'' کے عنوان کے تحت لکھتی ہیں۔

''ناول خاک دان داستان خونچکاں ہے۔ اسے چشم تر سے لکھا گیا ہے۔ ماضی کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے پچھتاوں کے ناگ، نوحہ خوانی کرتے ہوئے دل، تہذیب کی تباہی پر ماتم کرتے ہوئے وجود، اس زمین سے مٹتے جا رہے ہیں۔ نئی نسل کی اپنی ترجیحات ہیں۔ دنیا اپنے پر سمیٹ رہی ہے۔ وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ معلومات کا ایک سیلاب ہے۔ جو اے آئی کی شکل میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا رہا ہے۔ کتاب کہیں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہمارے ملک پاکستان کی طرح ہماری زبان اردو، ہمارا ماضی، جدوجہد آزادی اور اسلاف کے قصے قصہ پارینہ بنتے جا رہے ہیں۔ زبان کا ذائقہ، پیسے کا حصول اور رنگین سکرین کا جلوہ ہمیں منہدم کر رہا ہے۔ اس ناول کو لکھنے کا نہ تو ارادہ تھا نہ کوئی خیال بس لکھنا شروع کیا تو ناول بن گیا۔''

مصنفہ نادیہ عنبر لودھی کالم نگار، شاعرہ، مدیرہ، افسانہ نگار، کہانی کار، مترجم، نقاد اور محقق ہیں۔

ان کی دیگر قابل ذکر تصانیف میں ''گمراہ اور دوسری کہانیاں''، ''اردو کی خواتین ناول نگار'' اور ''معاصر اردو شاعرات''، شب غم کا جوش، دہلی اور آگرہ کے لودھی سلاطین کی تاریخ اور تعاقب میں خواب شامل ہیں۔

ناول کی کہانی دوسری جنگ عظیم سے شروع ہو کر تین نسلوں پر محیط ہے۔ یہ ہجرت کے کرب، قیام پاکستان کی جدوجہد، سماجی ناہمواریوں اور تہذیبی تباہی کے گرد گھومتی ہے۔ ناول میں دیس، پردیس اور دشمن ملک کی فضاؤں کو کہانی کا اہم حصہ بنایا گیا ہے۔

ناول کا انداز داستانوی ہے جس میں جاندار کردار اور مربوط پلاٹ قاری کی دلچسپی برقرار رکھتے ہیں۔ مصنفہ نے اپنے نسوانی کرداروں کو تانیثی ڈسکورس (discourse feminist) کے تناظر میں بھی پیش کیا ہے۔ جو کہ نادیہ عنبر لودھی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے

ناول کے اہم کرداروں میں کبیر، حسنہ، رفیق، جمیل زاہدہ، صفیہ، قدسیہ بیگم، اکبر خان، رشید خان، عظیم خان وغیرہ ہیں۔

زارا حیدر

ناول میں 13 ابواب شامل ہیں جو برما محاذ، ہجرت، تقسیم ہند، سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے تاریخی واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس ناول کا مقصد نئی نسل کو ان قربانیوں اور جدوجہد کی یاد دلانا ہے۔ جو ہمارے اسلاف نے پاکستان کے قیام کے لیے دی تھیں۔ یہ ناول ان افراد کی کہانی بھی ہے جن کے اپنے گلی کوچے ہجرت کے بعد اجنبی بن گئے۔

مجموعی طور پر ”خاک دان“ صرف ایک کہانی نہیں، بلکہ تاریخ اور درد کا ایک ایسا صحیفہ ہے، جس میں مصنفہ نے ماضی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے تہذیبی زوال اور انسانی نفسیات کی گہرائیوں کو بیان کیا ہے۔

یہ ناول برصغیر کی تقسیم، ہجرت کے کرب اور تین نسلوں پر محیط ایک خاندان کی داستان ہے۔ اس کی کہانی دوسری جنگِ عظیم کے دوران برما کے محاذ سے شروع ہوتی ہے اور قیام پاکستان کے وقت جالندھر (ہندوستان) سے ساندل بار (پاکستان) کی طرف ہجرت کے سماجی و ادبی اثرات کا احاطہ کرتی ہے۔

ناول میں خونی فسادات اور مسلمانوں کی بے سروسامانی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مرکزی خاندان جالندھر کے علاقے 'نکودر' سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچتا ہے اور اسے ساندل بار میں زمینیں الاٹ ہوتی ہیں۔

پاکستان پہنچنے کے بعد خاندان کے افراد (عظیم خان، رفیق خان، حسنہ اور دیگر) اپنی بکھری ہوئی زندگی کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پرانی یادیں اور بچھڑے ہوئے عزیزوں کا غم انھیں مسلسل ستاتا رہتا ہے۔

ناول نگار نے کرداروں کی نفسیات کا گہرا مشاہدہ پیش کیا ہے۔ ناول میں قدسیہ بیگم کا کردار نمود و نمائش اور نوابی ٹھاٹ باٹ کی عکاسی کرتا ہے۔ جبکہ محمد بی بی ایک سادہ مزاج اور گھریلو خاتون کے طور پر سامنے آتی ہیں۔

ناول کی کہانی پردیس اور نئی نسل کی کہانی بھی ہے۔ کہانی کا ایک بڑا حصہ انگلستان (برمنگھم) میں مقیم خاندانوں سے جڑا ہوا ہے۔ صفیہ کی شادی رشید خان سے ہوتی ہے جو اسے برطانیہ لے جاتا ہے۔ وہاں صفیہ کو ایک اجنبی ماحول اور شوہر کے بدلتے ہوئے رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہمارے اجداد نے آگ اور خون کا دریا عبور کر کے پاکستان بنایا تھا۔ یہ کہانی ہجرت کرنے والوں کی یادوں، ثقافتی ورثے کی منتقلی اور بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ خاندانی رشتوں میں آنے والی تبدیلیوں کی ایک مربوط روداد ہے۔

تقسیم ہندوستان کے کئی برس بعد پیدا ہونے والی ناول نگار نے جس کرب سے مہاجرین کے غم کا اعادہ کیا ہے۔ وہ مقام حیرت بھی ہے اور لائق تحسین و داد بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

ہائے رے میری تنخواہ

مجھے بیگم اقدس نے مشورہ دیا کہ میاں اس موضوع سے چشم پوشی اپنائیں اور قلم کو حالات ''قلم بند'' کرنے سے روک لیں۔

میں نے جواب دیا، ارے پگلی ....

جب پرائیویٹ ادارے ہمارا خون چوس سکتے ہیں ہمارے حقوق پامال کر سکتے ہیں۔ دن میں بھی تارے دکھا سکتے ہیں۔ دن دہاڑے جھوٹ بول سکتے ہیں، اپنے وعدوں سے انحراف کر سکتے ہیں اور تو اور جب ہماری تنخواہیں ہڑپ کر سکتے ہیں تو میں اس موضوع پر کیوں نہیں لکھ سکتا اور ساتھ میں یہ شعر بھی گنگنایا:

بے بس ہیں، بے زبان ہیں مقدر کے سامنے
کھلتی نہیں زبان، ستم گر کے سامنے

....

تذکیر و تانیث کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ تنخواہ کے لیے ''تنخواہ شریف'' یا ''تنخواہ شریفہ'' کا لفظ استعمال کیا جائے......؟ بہر حال بات ہے ''تنخواہ شریف'' کی لیٹ تشریف آوری کی۔ بھئی بڑوں کے سامنے کہنے سے تو رہے اور کوئی بھی صاحب بہادر بن کے ان کے سامنے اُف تک نہیں کر سکتا۔ تو سوچا کیوں نہ اپنے مجروح احساسات اور مچلتے جذبات کو الفاظ کی شکل دوں کیونکہ ہمارے صبر نے بھی جواب دے ہی دیا۔ تیس اور اکتیس دن بعد تو ہلال کمیٹی والوں کو بھی چاند نظر آ ہی جاتا ہے لیکن ہماری تنخواہیں دور دور تک نظر آنا تو دور کی بات، کہیں ان تنخواہوں کا نام و نشان بھی نہیں۔ بچوں کو لالی پوپ چوسنے میں اتنا مزہ نہیں ملتا ہوگا جتنا ہم صاحبان کو بروقت تنخواہ ملنے پر آتا ہے۔ لیکن معاملہ یہاں اُلٹ ہے مہینے بعد تنخواہ کی اُمید کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''انگور کھٹے ہوں''۔

جناب روزانہ کی بنیاد پر جو معاوضہ دیا جاتا

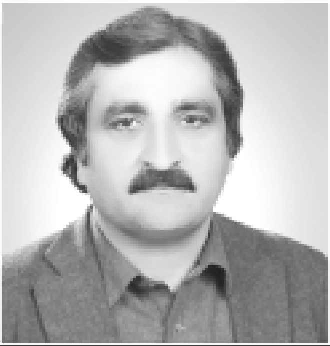

ہمایوں خان

ہے اُسے ڈیلی ویجز کہتے ہیں۔ مہینے بعد جو ملتی ہے اُسے ماہانہ تنخواہ کہتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے جب اَسی ۸۰ اور نوے ۹۰ دنوں بعد جو اکلوتی اور لاڈلی تنخواہ دی جائے اُسے کیا کہا جائے.....؟

ہم جیسے بے چاروں کی آہ و بکا سننے والا کوئی نہیں ایسی بے چارگی کے دنوں میں تنخواہ کے لیے تھک وددو کرنا ''بھینس کے آگے بین بجانے'' کے مترادف ہے۔ اب صرف اتنا عرض ہے کہ:

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لادوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

....

آج کل تنخواہیں بھی بالغ ہوتی جا رہی۔ مہینے کے پہلے عشرے میں بچپن اور لڑکپن گزار لیتی ہیں۔ دوسرے عشرے میں جوان ہو جاتی ہیں اور تیسرے عشرے میں بالغ ہو جاتی ہیں اور اگلے مہینے کی پہلی تاریخ (یکم) آتے ہی بالغ ہو جاتی ہے اور باپردہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پھر کم کم ہی نظر آتی ہیں۔ تنخواہ کا حصول اتنا طویل ہو جاتا ہے عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔ بھئی اتنے دنوں میں تو اچھا خاصا گھریلو اچار بن جاتا ہے۔ انڈوں پر مرغی بیٹھی رہے تو رنگ برنگے چوزے نکل آتے ہیں۔ درختوں پر آم پک جاتے ہیں۔ جامن کے درخت پر جامن اپنے جامنی رنگ میں تبدیل ہو کر کھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اتنے دنوں میں تو خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑ لیتا ہے اور تو اور اتنے دنوں میں تو املی کی کھٹلیاں بھی کھٹی مٹھاس کے ساتھ ''صنفِ نازک کے نرم و نازک'' ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہیں مگر ہائے رے میری تنخواہ..........!!

نہ تُو آئے گی نہ ہی چین آئے گا

....

آج کل ہماری حالت بھی اُن دودھ پیتے بچوں کی طرح ہو گئی ہے جو رات کو مسلسل بے چین رہتے ہیں۔ ہم بھی بے چین کیوں نہ رہیں.....وجہ.....وہی تنخواہ......بھئی نہ جانے ہماری یہ تنخواہیں کس بھٹی میں تیار ہو رہی ہیں۔ جو پکنے کا نام نہیں لے رہیں۔
اس ضمن میں بعض پرائیویٹ سکولز اور کالجز اپنے ایمپلائز کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ''رسی جل جائے مگر بل نہ جائے''۔ اگرچہ بیشتر پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں صباحی اسمبلی میں علامہ اقبال کی دعائیہ نظم کا یہ شعر بھی پڑھا جاتا ہے:

میرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو رہ ہے اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

لیکن حالات اور واقعات علامہ اقبال کے اس شعر کی نفی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالات جوں کے توں ہیں اور ہم تنخواہوں کے لیے بے چین و بے قرار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سچ سننا انتہائی مشکل ہوتا ہے مگر سچ پڑھنا اس سے بھی کہیں زیادہ ہضم نہ ہونے والا عمل ہے جبکہ سچ لکھنا بڑے ہی دل گردے کا کام ہے۔ ادیبوں کو دانشمندی اور تجربہ کار مخلوق کا درجہ حاصل ہے۔ اسی مخلوقیت کے چکر میں ہم نے مطلوبہ مسئلہ اپنے ادیب دوستوں کے سامنے پیش کیا۔ بعض دوستوں نے تو صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے گم شدہ تنخواہوں کی فاتحہ پڑھ لی۔ لیکن اس کے باوجود چند ادیب دوستوں نے مفید مشورے بھی دیئے۔ ایک مہربان دوست نے رائے دی کہ "تنخواہ" کے لیے ریسکیو 1122 کا سہارا لو اور اسی میں بیٹھ کر تنخواہ کے لیے کالج چلے جاؤ تاکہ ان کو آپ کی شدت حاجت کا احساس ہو جائے۔ ایک دوست نے نسوار کی تہہ بٹھاتے ہوئے کہا آپ بینڈ باجے (ڈی جے) کی ٹیم ساتھ لے جائیں شاید وہ مست ہو کر آپ کو تنخواہ کی ادائیگی کر لیں۔ ایک اور مہربان قدردان دوست نے مشورہ دیا کہ آپ "ہاتھ بجانے والی جنس" ساتھ لے جائیں پھر شاید تنخواہ کے حصول میں آسانی میسر ہو۔ ایک بے تکلف دوست نے تو حد ہی کر دی کہنے لگا اپنے خاندان میں کسی بزرگ کی ٹوڑی ململ سے باندھ لو اور تصویر واٹس ایپ کر لیں اور کالج سربراہ سے کہہ دیں کہ حضرت وفات پا چکے ہیں، تدفین کے لیے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ "گم شدہ تنخواہیں" یکمشت بطریق احسن ارسال کر دیں تاکہ تدفین کے فرائض بخوبی سرانجام پا سکیں۔ "اگلی تنخواہ کی تازہ ترین وصولی" تک دعا گو رہوں گا کیونکہ ہم سب امید سے ہیں۔

صبح سویرے گھر سے نکلتے ہوئے بیگم صاحبہ قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے پوچھتی ہے کہ تنخواہ کب ملے گی لیکن صوم وصلوۃ کی پابند بیگم صاحبہ اگلے ہی لمحے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتی ہے۔ تو جی چاہتا ہے کہ ان کو گھوڑے، اونٹ، بھیڑ، بکریاں حتیٰ کہ چوزے تک بیچ کر خواب خرگوش کے مزے لینے سے نہ جگایا جائے۔ جب انسان ذہنی خلفشار اور الجھن کا شکار ہو۔ ہر وقت دل و دماغ اور ذہن تنخواہ ملنے اور نہ ملنے کی غیر یقینی صورتحال سے دوچار ہو گھر کا ہر فرد چھوٹا ہو یا بڑا، بچے اور بیگم اقدس گھور گھور کر تنخواہ ملنے کی آس لگائے ہوئے ہوں تو بخدا سانسیں گلے میں اٹک جاتی ہیں۔ کام کرنے والے کا معاوضہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے دینے کی اسلامی و

اخلاق تلقین پر کوئی عمل پیرا نہیں ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ ہم مسلسل محنت کرتے ہیں تو ہمارا پسینہ خشک ہی نہیں ہوتا۔ اب تو دل عجیب طرح سے گھبراتا ہے۔ بقول شاعر:

یہی انداز تجارت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

آج کے جدید سائنسی ، معاشرتی و معاشی نفسانفسی کے اس دور میں سب سے زیادہ مظلوم شعبہ اور طبقہ پرائیویٹ ٹیچرز اور لیکچررز کا ہے۔ آج کل تو سب گم سُم نیم دیوانگی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ حال یہ ہے کہ ایسے سفید پوش، باحیا اور انا پرست کے اپنی جائز تنخواہ کے حصول کے لیے بھی کلرک آفس جاتے ہوئے شکل وصورت اور چہرے سے اتنے معصوم اور شرمیلے نظر آتے ہیں جیسے پہلی بار سسرال کی دہلیز پر قدم بوسی کا شرف حاصل کر رہے ہوں۔ ہماری ''کم شدہ تنخواہیں'' بھی کرونا ویکسین کی طرح آج کل قسطوں میں مل رہی ہیں۔ سونے پے سہاگہ یہ کہ اب تو حد ہو گئی کیونکہ رہی سہی ''کم شدہ تنخواہوں'' سے مزید کٹوتیاں وقتاً فوقتاً ہو رہی ہیں۔ کبھی ٹیکس کٹوتی، کبھی انشورنس کٹوتی، ورکشاپ کٹوتی، ویلکم اور فیئر ویل پارٹی کٹوتی، انگلش لینگویج کلاس کٹوتی اور صاحب اس طرح پھر ان کٹوتیوں کا سلسلہ اتنا طویل در طویل ہو جاتا ہے کہ ہم غریبوں کے ساتھ صرف اور صرف سوچنے، سمجھنے اور پرکھنے کی ''کسوٹی'' ہی باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن ہمارے اساتذہ انتہائی سادہ لوح ہیں کہ یہ پرائیویٹ ادارے ان کے ساتھ ''سانپ سیڑھی والا میٹھا کھیل''، کھیل رہے ہیں۔ بقول شاعر:

وہ اس کمال سے کھیلا تھا عشق کی بازی
میں اپنی فتح سمجھتا تھا مات ہونے تک

اگر پرائیویٹ ادارے درس و تدریس کی کشتی کو تلاطم خیز موجوں میں پار لگانا چاہتے ہیں تو پھر اُن کو کشتی کے چپو میں توانائی، ہنر و کمال، مضبوطی اور چپو کی لچک کو برقرار رکھنا ہوگا ورنہ اندیشہ ہے کہ میں بھی نقل مکانی پر مجبور ہو جاؤں یا مجھے نکل مکانی کا پروانہ تھما دیا جائے مگر نقل مکانی تو اپنی مرضی سے ہوتی ہے اور نکل مکانی دوسروں کی مرضی سے۔ کیونکہ نکل مکانی میں آپ کو نکالا جاتا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ ''مجھے کیوں نکالا......؟؟'' بلکہ میں فرصت اور فراغت کے لمحات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غنیمت سمجھ کر ابن انشاء کا یہ شعر گنگناتا ہوا رختِ سفر باندھ لونگا کہ:

انشا جی اُٹھو ، اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کو لگانا کیا......؟

☆☆☆☆☆

”مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے“ (طنزومزاح)

نور کمال شاہ

بھئی سادگی اور سادہ لوحی کی بھی ایک حد ہوتی ہے اب اوروں کو بھلا کیا الزام دیں جب ہم خود ہی برسوں تک پنڈی کو ”لاور پنڈی“ نہ صرف کہتے بلکہ سمجھتے بھی رہے اور اس میں اپنا قصور کچھ اتنا زیادہ رہا بھی نہیں اول تو علم ان دنوں آج کل کے ریوڑیوں کی بانٹ کی طرح بوریوں کے حساب سے نہیں بٹ رہا تھا اور دوم ! دور دراز صوبے کے ایک پسماندہ ضلعے میں رہتے ہوئے لاہور اور راولپنڈی کو دیکھنا تو درکنار: ہم نے تو ان شہروں کے نام بھی کبھی نہیں سنے تھے بس مبہم سا تصور یہی تھا ذہن میں کہ شاید لاہور اور پنڈی کے ملاپ سے ہی ”لاہور پنڈی“ بنا ہوگا اور اسی حساب سے دونوں شہر بھی قریب یکساں اور تقریباً پاس ہی ہوں گے یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملتان کو مردان کا سوتیلا بھائی جان کر ہم اپنی فطری ذہانت پہ باقاعدہ بغلیں بجا رہے تھے ہمیں تو خیر یہ بھی بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ”قصور“ میں رہنے والوں کا اصل میں کوئی جرم یا قصور نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ تو پیدا ہوکر ویسے ہی ”بے قصور“ اس شہر بے خطا کا حصہ بن جاتے ہیں۔ شروع شروع میں تو ہم یہ جان کر کافی حیران بھی ہوئے تھے کہ لوگ اگر معصوم ہیں اور قصوروار بالکل بھی نہیں تو پھر ”قصور“ میں رہنے کی کیا تک بن سکتی ہے بھلا شرفا میں شمار ہونے کے لیے وہ تونسہ شریف، اجمیر شریف یا پھر سیدو شریف میں جا کر سکونت کیوں اختیار نہیں کر لیتے شکر ہے بعد میں پانچویں کی مطالعہ پاکستان نے یہ گتھی سلجھا دی اور ہمیں اپنی نالائقی و بے وقوفی کا قائل ہونا ہی پڑا معلوم ہوا کہ راولپنڈی شہر تو طاقت کا سرچشمہ ہے کیوں کہ ملک کے بڑے فوجی ہیڈکوارٹر کے ساتھ ساتھ اقتدار کی بساط الٹنے کو ہر دم تیار ہمارے سیاسی میدان کے چیدہ چیدہ کھلاڑی بھی یہاں ہی بسیرا کیے ہوئے ہیں لاہور مینار پاکستان کے تاریخی سائے میں واقع دریائے راوی کے کنارے آباد شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کے بڑے مشہور شہر کا نام ہے جہاں کے مقبرے میں آسودہ ملکہ ہندوستان آج بھی شہر کی حالت دیکھ کے اپنی بے وقت موت پہ کلمہ شکر ادا کرتی دکھائی دیتی ہے کسی زمانے میں راوی کا دریا لاہور کو گھیرے ہوئے تھا مگر آج کل شہر لاہور پورے ”راوی“ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے!!!

جہاں تک کہ ہماری ذات کا تعلق ہے، سمجھنے بوجھنے کے معاملے میں ماضی میں اپنا ریکارڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں رہا (اتنا تو خیر ہمیں یقین ہے کہ ہم بے وقوف تو کم از کم ہو نہیں سکتے) کسی غیر کا ہاتھ لگنے سے ہمیں نہ صرف شدید گدگدی ہوتی ہے بلکہ چیک پوسٹ پر کھڑے پولیس کو دیکھ کر ہمارے رونگھٹے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اکثر اوقات کسی پولیس اہلکار کی جامہ تلاشی کو بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو مصافحہ سمجھ کر ہم نے ان سے بغل گیر ہونے کی بارہا ناکام کوششیں بھی کی ہیں، یہاں تک کہ بے چارے پولیس اہلکار کو بڑے ادب سے کان میں سرگوشی کر کے ہمیں سمجھانا اور پیچھے دھکیلنا بھی پڑا کہ بندہ خدا! ہم جسمانی تلاشی کی آڑ میں آپ کی جیبیں اور نیفہ ٹٹولنے لگے ہیں، کوئی معانقہ نہیں کر رہے آپ سے؛ سو براہ کرم خود کو سنبھالیے اور دل کو قابو میں ہی رکھیے گا------!!!

سیاسی افراتفری کے دور میں اپنے صوبے کے ایک وزیر صاحب نے کسی بات پہ ناراض ہو کے ہمارے علاقے کے ایک استاد صاحب کا تبادلہ ''پولینڈ'' کو کروا دیا اب وہ بے چارے حیران و پریشان کئی دن پوچھتا اور نقشے کنگھالتا رہا کہ دنیا کے نقشے پر ''پولینڈ'' نامی ملک تو واقعی موجود ہے اور نہایت آسانی سے ڈھونڈا بھی جا سکتا ہے مگر وطن عزیز کی چار دیواری میں آخر پولینڈ کہاں سے آ گیا؟ کہیں سچ مچ ہمارا تبادلہ پولینڈ نامی غیر ملکی علاقے کو تو نہیں ہوا؟ اور اگر بر قیاس سخن، ایسا ہی ہوا ہے تو بنا ویزے پاسپورٹ کے ہم وہاں پہنچیں کیسے؟ کھانا پینا چھوٹ گیا بے چارے کا؛ محکمہ تعلیم کے اہلکاروں نے پہلے تو انہیں ''خوف'' کی کافی مقدار بہم پہنچائی اور خوف زدگی کے مطلوبہ معیار تک پہنچانے کے بعد ان کی یوں رہنمائی فرمائی کہ بھائی! کیوں ہماری نوکری کے پیچھے پڑا ہوا ہے ویزے پاسپورٹ کی فکر کو چھوڑ دیں؛ ''پولینڈ'' دراصل ہمارے اپنے ہی ضلعی علاقے کے پہاڑی سلسلوں میں واقع ایک چھوٹے سے دشوار گذار گاؤں کا نام ہے پتہ سمجھا کے بولے کہ آپ فوراً سے پیشتر وہاں پہنچ کے ذمہ داریاں سنبھالیں، ہمیں وزیر صاحب کو رپورٹ بھی تو دینی ہے پھر..........!!!!

سکول کے زمانے میں ہمارے ایک طالب علم ساتھی کو ''دختر کوچک'' کا تلفظ ادا کرنا نہیں آتا تھا ان دنوں ہم غالباً چھٹی جماعت میں پڑھ رہے تھے اور استاد محترم کی بے انتہا ترغیب پہ ہم نے فارسی کو بطور اختیاری مضمون رکھ لیا تھا یہ نسبتاً چھوٹی سی کتاب تھی اور یہی کم ضخامت اس انتخاب کا معیار ٹھہرا تھا سکول میں ہمارے پڑھنے کا انداز یہ ہوتا کہ استاد محترم کتاب سے عبارت پڑھتے اور ہم پیچھے ان ہی کے الفاظ کو بلند آواز سے دہراتے جاتے ایک دن سبق کے بیچ میں لفظ ''دختر کوچک'' یعنی چھوٹی بیٹی سامنے آیا اور اسے استاد کے پیچھے

دہراتے ہوئے ہمارے ایک ساتھی نے اسے عجیب سے تلفظ کے ساتھ ادا کیا جسے استاد محترم نے بھی شاید سن لیا تھا تبھی تو وہی لفظ اسے دوبارہ، سہ بارہ ادا کرنے کو کہا گیا اور مذکورہ طالب علم کی زبان سے عجیب سا تلفظ سن کر ہم سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے وہ ظالم ''دختر کو چک'' کو دختر چوکک'' پڑھ کر ادا کر رہے تھے ہر ممکن کوشش ہوئی؛ لفظ کو ٹکڑوں میں کاٹ کر کہلوایا گیا؛

استاد محترم ہونٹوں کو گول بناتے ہوئے کہتے؛''میری طرف دیکھ کے بولو''کو''؛

وہ طالب علم اعتماد سے دہراتے، ''کو''------

استاد صاحب ہونٹوں کو کھلا چھوڑتے ہوئے دوسرا حصہ پڑھتے''چک''

طالب علم بھی اسی طرح دہراتے ''چک''----

''ہاں شاباش! ٹھیک ہے'' مگر جب استاد صاحب الفاظ کو ملا کے پوری ترکیب پڑھتے ''دختر کو چک'' تو جواباً ''دختر چوکک'' ہی سننے کو ملتا سارا پیریڈ ایسے ہی گزرا ہم ''دختر کو چک'' سے آگے نہ بڑھ پائے ہنستے ہنستے ہمارا برا ہی حال تھا قہقہوں سے کمرے کی چھت اڑی جا رہی تھی مسلسل تین دن تک یہی شغل جاری رہا مگر جب سدھار کے کچھ آثار نمودار نہیں ہوئے اور ''دختر چوکک'' کو ''دختر کو چک'' میں بدلنے کی ساری ترکیبیں بے کار گئیں تو استاد محترم نے لاچار ہو کر انتہائی بے بسی کے عالم میں کہا؛ بیٹا! چلو ٹھیک ہے؛ تمہارا والا ہی ٹھیک ہے؛ ''دختر کو چک'' لفظ ہو سکتا ہے تو ''دختر چوکک'' بھی تو عین ممکن ہے؛ تم یوں ہی ادا کرتے رہو------

واقعہ سن کر استاد یاری خان کی رگ ظرافت بھی پھڑک اٹھی؛ ہنسی کا دورہ پوری طرح نمٹانے کے بعد اپنا دایاں ہاتھ زور سے ہماری بائیں ران پہ مارتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہنے لگے؛'' ہم سکول کے پورے عرصے میں''رحجان'' کو''رجحان'' پڑھتے اور لکھتے رہے تا دیر کہ اساتذہ کی تربیت کے ایک پروگرام میں ایک عمر رسیدہ انسٹرکٹر صاحب نے وضاحت نہیں فرمائی کہ''دیکھو! یہ لفظ اصل میں ہے تو رجحان، مگر اس کو پڑھنے میں یہ''رحجان'' بن جاتا ہے؛ اس لئے آپ بھی اسے رجحان لکھتے اور رحجان ہی پڑھتے رہا کیجیے''اور ہمیں اپنی کوتاہ فہمی کا پہلی دفعہ علم ہوا کہ محض اتنی سی بات ہماری سمجھ میں پہلے کیوں نہیں آئی تب سے ہم نے صحیح معنوں میں اس لفظ کو''رحجان'' پڑھنا اور ''رجحان'' لکھنا شروع کر دیا

سکول کے زمانے میں امتحان کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ بنچوں کی کمی کے باعث دو مختلف جماعتوں کے طلبا کو ایک ہی بنچ پر بٹھا دیا جاتا تھا اور وہ اپنے اپنے متعلقہ کلاس کے پرچے حل کرتے جاتے تھے فرنیچر کی کمی کے حل کے ساتھ ساتھ اس طریقے سے امتحان کی

شفافیت بھی یقینی ہو جاتی تھی دسویں کے ساتھ پانچویں جماعت کا بچہ بٹھا لیا اور آٹھویں کے ساتھ چھٹی کلاس کا علیٰ ہذا القیاس......

ہم غالباً آٹھویں جماعت میں تھے اور ہمارے ساتھ بنچ پر چھٹی جماعت کے طلبا کو بٹھایا گیا تھا میرے ساتھ جو بنچ شریک طالب علم بٹھائے گئے تھے وہ ہمارے اسی سکول کے ایک استاد محترم کے فرزند ارجمند تھے بدقسمتی سے وہ اپنی نالائقی کے معراج پر تھے بلکہ نالائقی کے جس اعلیٰ درجے پر وہ متمکن تھے ہمارے خیال میں وہاں تک کسی دوسرے کی پہنچ ممکن ہی نہیں تھی پرچہ شروع ہونے سے قبل ان کے والد اور ہمارے استاد محترم نے انتہائی رازداری سے ہمیں ایک طرف لے جا کر اعتماد میں لیتے ہوئے پرچے میں بیٹے کی ہر ممکن مدد کا حکم صادر فرما دیا تھا پرچے کے دوران بموجب حکم سرکار، ہم وقتاً فوقتاً خالی جگہوں کی خانہ پری اور مختلف سوالات حل کرنے میں اس کی مدد کرتے رہتے پہلے ہی دن کا ذکر ہے؛ مدھم سی آواز میں اسے جواب املا کراتے ہوئے ہم نے ان کی لکھائی کی طرف جو نظریں دوڑائیں تو یقین مانیں؛ ہاتھوں کے طوطے پھر سے اڑ گئے واقعی ہم دنگ ہی تو رہ گئے تھے؛ گویا.....

ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے !!!

پہلے تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ ظالم لکھ کیا گئے ہیں؛ بعد میں بہت غور و فکر کے بعد پرچے پر لکھی ٹیڑھی میڑھی سطروں کے بیچ پوشیدہ عبارت کو انتہائی توجہ سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ بدبخت، بندۂ نالاں، دشمن امتحان الٹی لکھائی لکھ رہے ہیں؛ یعنی اردو بجائے دائیں سے بائیں لکھنے کے بائیں سے دائیں لکھ رہے ہیں اور وہ بھی یوں جیسے کسی کارڈ کی لکھائی آئینے میں الٹی دکھائی دیتی ہو خون کے گھونٹ پی کر ہی رہ گئے جبکہ وہ بے نیاز انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر تحریر کی شکل میں لاگرتھم کی اشکال بنانے میں ہمہ تن مصروف رہے پرچے کے اختتام پر اصلاح احوال کی خاطر ان کے والد بزرگوار اور ہمارے استاد محترم کو یہ صورت حال سنائی تو وہ بڑی بے نیازی کے عالم میں بولے؛ خیر کوئی بات نہیں؛ یہ ناہنجار کھبے ہیں؛ الٹے ہاتھ سے الٹی تحریریں لکھنا ہی اس کا شیوہ ہے، آپ پریشان نہ ہوں؛ ان کے لیے یوں بھی ٹھیک ہے، کوشش کریں کہ بس وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہا کریں یقین کریں حکیم مومن خان مومن صاحب بھی یار کی الٹی ادائیں دیکھ کر اتنے پریشان نہیں ہوئے ہوں گے جتنے ہم وہ تو خیر ''مومن'' تھے سو کسی نہ کسی طرح حالات اور محبوب دونوں سے ہی نباہ کر بیٹھے مگر ہم ٹھہرے فاسق و فاجر سو ناچار ہم نے مومن کے شعر پر ہی خود کو دلاسا دینے کی کوشش کی؛

بنے کیوں کر کہ ہے سب کار الٹا
خط الٹا، بات الٹی، یار الٹا

مگر حیرت ہے کہ اتنی ''الٹاہٹ'' کے باوجود بات سیدھی ہی بیٹھ گئی-----

نتیجے کے دن وہ لڑکا کامیاب ہو کر اگلی جماعت میں پہنچ چکا تھا۔

زمانہ عروج خطوط نویسی کی بات کرتے چلیں تو یہاں ہم اس اعتراف میں خود کو سو فی صد حق بجانب سمجھتے ہیں کہ خطوط کے معاملے میں مرزا غالب جتنے معروف تھے، بلاشبہ اپنے گاؤں میں اتنے ہی مشہور ہم بھی رہے پورے محلے میں ہمارے نام کا ڈنکا بج رہا تھا محلے بھر میں آس پاس کے بڑے بوڑھے (کبھی کبھار بوڑھیاں بھی) کراچی میں مقیم اپنے بیٹوں کو خطوط لکھوانے کے لیے ہماری ہی خدمات حاصل کرتے جو انھیں فقط ایک کپ چائے کے عوض فوراً ہی دستیاب ہو جاتی تھیں یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب محض کراچی ہی تک ہماری پرواز تھی، باہر کے کسی ملک جانے کا رواج ابھی ہمارے ہاں کم پڑا تھا ان دنوں ہم غالباً پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے اور اس پر بھی اتنے باکمال کہ اردو میں بڑی روانی سے فر فر خط لکھ مارتے تھے وہ بات جس سے مجھے شدید چڑ تھی یہ تھی کہ مکتوب الیہ کو پشتو میں املا کرائی گئی باتیں اردو میں لکھنا ہوتیں اور خط مکمل ہونے کے بعد ان ہی الفاظ میں دہرانی بھی پڑتیں کیونکہ فریق موجود کا مطالبہ ہوتا کہ اچھا! اب سناؤ کیا کیا لکھ دیا ہے؟ اسی خطرے اور خدشے کے پیش نظر بہت ساری باتیں جن کا لکھنا ان دنوں ہمارے کمزور ذہن اور چھوٹے سے حافظے سے بعید تھا، یاد رکھنی پڑتیں تھیں کہ دہرائی میں آسانی سے سنائی جا سکیں اور لکھوانے والے کو پوری تسلی دی جا سکے کہ محترم! آپ کی زبان مبارک سے نکلی ایک ایک بات قلم زد ہو چکی ہے ہمیں یاد ہے ایک دفعہ یوں ہوا کہ بیٹے سے شدید ناراض ایک عمر رسیدہ پڑوسی نے ہمیں خط لکھوانے کے لیے بلا بھیجا عشا کا وقت تھا اور لالٹین کی مدھم روحانی روشنی میں خط لکھوایا جانا تھا خیر وہاں پہنچ کر جیسے ہی ہم نے کاغذ قلم سنبھالا تو فوراً ہی ہدایت ملی کہ دیکھو برخوردار! دعا سلام بالکل بھی نہیں لکھنی؛ کسی کی خیریت وغیرہ کا ذکر بھی بالکل نہیں کرنا ہے؛ لکھیں کہ میرے ناپسندیدہ اور نافرمان بیٹے؛ تم کبھی خوش اور سلامت نہ رہو، تم پر لعنت ہو، تم کبھی بھی سکھ نہ پاؤ----

اوسان ہی خطا ہو گئے اس قسم کا گلوں شکووں اور بددعاؤں سے بھرا خط ہم پہلی بار لکھ رہے تھے اور شاید رشتوں کے بیچ حائل نفرتوں سے بھی پہلی دفعہ شناسائی ہو رہی تھی خیر ہم نے خود کو سنبھالا؛ سامنے پڑی چائے سے اٹھتی بھاپ کو ایک نظر غور سے دیکھا، گرم چائے کا ایک گھونٹ لیا جس نے زبان تو جلا دی مگر سنبھلنے کا موقع مل گیا اور ہم نے بالکل روایتی انداز میں دعا وسلام سے خط کا آغاز کر دیا گلوں شکووں کے علاوہ باقی باتیں ہم نے اپنی طرف سے شامل کر دیں؛ ہاں البتہ حافظے کو اس دن بالکل چوکنا اور بیدار رکھنا تھا کہ آخر مکتوب الیہ کے والد صاحب کی تمام بتائی ہوئی باتوں کو ان کے سامنے من وعن دہرانا بھی تو تھا------!!!!

☆☆☆☆☆

انہدام

یہ میری دیمک لگی کتابیں
یہ نینوا کی اجل شکستہ، گلی کتابوں کی داستانیں
یہ عہد نامے، یہ کرمِ تحریف سے لدی،

بھربھری کتابیں
پیمبرانِ خدا کے ناقص۔سند قصص،
انحراف آمادہ اُمتوں کی کہانیاں ہیں
ورق ورق فلسفوں کی مربوط داستانیں
یہ عقل و دانش بھری کتابیں
تمام الحاد و زندقہ ہیں
مرے زمانے کی روشنی کے لیے نہیں ہیں
یہ مشرقی اور مغربی حسن کار ذہنوں کی
سعیِ پیہم کی داستانیں
مرے زمانے کی تیرگی کے لیے نہیں ہیں

یہ حرفِ غم، میری روح کا ایک دائمی زخم بن چکا تھا
سو یہ کتابیں سُلگ رہی ہیں!
جمیل ذہنوں کی داستانیں دُھواں دُھواں ہیں!
اِدھر نہ دیکھو!
کہ یہ مرے شہرِ منہدم کے ستم رسیدہ،
شرار دیدہ وجود کا سرمئی دُھواں ہے
یہ حرفِ غم، میری روح کا ایک دائمی زخم بن چکا تھا
یہ غم مرے شہرِ منہدم کے شرار دیدہ وجود کا سرمئی دھواں ہے
اِدھر نہ دیکھو!
کہ یہ مرا سرمئی دھواں ہے!

خالد احمد

کفارہ

بڑی غفلت ہوئی
محسن ستاروں کی
دلِ توقیرِ واجب میں
ادا کرتے ہیں کفارہ
وقارِ منصبِ انصاف کا بھی
دن مناتے ہیں
سرِ دیوارِ شہرِ دل،
ہر اک شہ چوک میں،
کھمبوں، درختوں پر،
خبر خانوں میں،
فکروفن کے ایوانوں میں،
ساری عدل گاہوں میں،
مبارک موسموں کا راستہ تکتی
نگاہوں میں
سجاتے ہیں
تمام اُن منصفوں کی
نورِ تصویریں
جنھوں نے آمرانہ حلفِ شیطانی کو
سنگِ نعرۂ انکار کی زد پر رکھا
اندھے غرورِ جبر کو
سچ کے بھڑکتے
شعلۂ پندار کی زد پر رکھا
خود کو دفاعِ مصحفِ آئین کی
بیدار سرحد پر رکھا
جزرِ حمیت کی ہواؤں میں بھی
اپنا حوصلہ مد پر رکھا
تمکینِ میزاں کا عَلَم
اوجِ روایات اب وجد پر رکھا

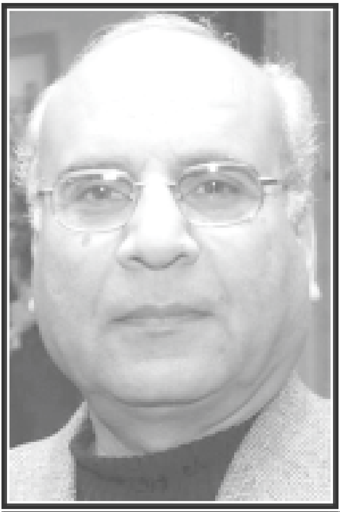

جلیل عالی

جارحیت کی سہولت کاری

جارحیت کی سہولت کاری
خارجیت سے بڑا جرم ہے

جارحیت کی سہولت کاری
ایک بیوپار ہے
شہر کے شہر کھنڈر کرنے کا
بستیاں زیر وزبر کرنے کا
کو بہ کو، خیر کو شر کرنے

جارحیت کی سہولت کاری
ایک پیکیج ہے،
کہ جس کی رُو سے
بھائی کو بھائی سے مروانا ہے
قتلِ انبوہ کا پروانہ ہے
آتشِ حشر کو دہکانا ہے

فیصلہ آپ پہ ہے
آپ کے ایمان پہ ہے
اور میزان پہ ہے
جس کے اک پلڑے میں ہے
جارحیت کی سہولت کاری
دوسرے پلڑے میں ہے حقِ دفاع

دیکھنا یہ ہے کہ کس پلڑے کو
باروَر کرتے ہیں آپ
قسمتِ نوعِ بشر کرتے ہیں آپ

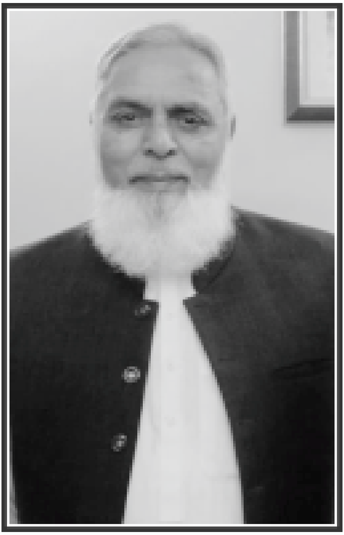

محمد انیس انصاری

ہم پوچھتے ہیں

ہم پوچھتے ہیں
وہ کون تھے جن کے ہاتھوں سے
سب خواب ہمارے ٹوٹ گئے
سب ساتھ سہارے چھوٹ گئے
وہ دن آخر کیسا دن تھا
تھی آدھی شب، آدھا دن تھا
ہم لوحِ جبیں پر کرنوں سے
چاند اور ستارے لکھتے تھے
کچھ آنے والے وقتوں کے
کچھ گزرے ہُوئے زمانوں کے
رمز اور اشارے لکھتے تھے
اِتنے میں اِک یلغار ہُوئی
اور دھرتی سرخ انگار ہُوئی
وہ تیز ہوائے ظلم چلی
وہ محشر برپا ہم پہ ہُوا
ہم ریزہ ریزہ ہو بکھرے
وہ ہاتھ جو ہم پر اُٹھے تھے
کیا ہم نے اُنھیں مروڑ دیا
جن پاؤں تلے ہم روندے گئے
کیا ہم نے اُن کو توڑ دیا
کیا اہلِ ستم سے ارضِ وطن
خوں نذرانے سے پاک ہُوئی
ہم انجانوں کی ہستی تو
اس عرصۂ غم میں خاک ہُوئی
اَب کیا دہرائیں وہ منظر
کیا یاد دلائیں وہ منظر
تم جانتے ہو، تم واقف ہو
ہم تم سے اتنا پوچھتے ہیں
وہ کون تھے جن کے ہاتھوں سے
سب خواب ہمارے ٹوٹ گئے
کیا کوئی ہمیں بتلائے گا
کیا کوئی ہمیں سمجھائے گا
ہم پوچھتے ہیں،
ہم پوچھتے ہیں

خاور اعجاز

محرومی

میں اپنے غم کو تنہا سہہ رہا ہوں
مگر چُپ ہوں
کہ کتنے سال پہلے
وہ میرا غم گسار و رہبر و مونس
مجھے بے وقت
تنہا چھوڑ کر یاں
گیا — اور لوٹ کر آیا نہیں ہے!!

خوف

مجھے اک خوف سا رہتا ہے ہر دم
کہ میں خود سے بھٹکتا جا رہا ہوں
مری لامرکزی اس خوف کا
منبع بھی ہے اور انتہا بھی

مری سوچوں پہ اک عرصے سے محور ہے
مری آشفتہ حالی کا بھرم
جس میں مقید ہیں
مرے ارماں، مری ناکردہ کاری
اور اس کا شاخسانہ!!

سید افسر ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

آتے ہوئے دن کے لیے گزرے ہوئے دن پر
ہم کو صفِ ماتم بھی بچھانے نہیں دیتے

نعمان منظور

نظم: صابر رضا کے لیے

آئنۂ دل میں جابجا ہے تُو
میری سوچوں میں بس رہا ہے تُو

معجزہ ہے سخن سرائی کا
پار دریا کے آملا ہے تُو

اپنی دیوانگی کا حاصل ہے
اپنے لہجے میں بولتا ہے تُو

وادیٔ جاں کی راج دھانی میں
بانسری بن کے بج اُٹھا ہے تُو

ہر نظر کو تری تمنّا ہے
پھول بن کر جو کھل اُٹھا ہے تُو

اپنے پیاروں کی ہر خوشی تیری
اپنے یاروں کی ہر صدا ہے تُو

ختم ہونے پہ جو نہ آئے کبھی
ایسی چاہت کا آسرا ہے تُو

اِک چراغِ رہِ محبت ہے
ایک اخلاص کا دیا ہے تُو

ترے ورثے میں شاعری آئی
اپنے اجداد سے جُدا ہے تُو

نثار ترابی

پوروں سے بنائے ہوئے درخت

ٹارگٹ کِلنگ کے
طویل سلسلے کے
مقتل میں

وہ
درخت بھی شامل ہیں
جن پر
ہمارے نام کُھدے ہوئے تھے

ہماری پوروں سے
اب بھی لہو رِستا ہے

ان کے بکھرتے پتّے
دل میں
ٹہنیاں بناتے بناتے
پھر ___ درخت بن چکے ہیں

لیکن ___ اب ان پر
بیٹھنے والے پرندوں کے گیت
ہکلاہٹ کا شکار ہیں

ڈر
بھیگے پروں سمیت
وریدوں میں بیٹھ چکا ہے

تنویر قاضی

برف خانے میں رکھی ہوئی نظم

ہم پرچھتیوں پر
نظم رکھ کر بھول جاتے ہیں

باغ کے کانٹے کی چبھن لِیے
وہ سانس لیتی ہے
ہماری طرح

پرندوں جیسی نظم
ہمارے ہاتھ نہیں آتی

وہ کسی چوراہے میں
گولی کا نشانہ بن جاتی ہے
ماورائے عدالت قتل

کسی برف خانے میں
رکھی ہوئی نظم
ہمیں بُلاتی ہے
اُس کے ہاتھ میں
کوئی سندیسہ ہے

نظم

بہت عرصہ ہوا جانم
ہمیں اتنا ہی کہنا ہے
تمھیں آنکھوں میں رکھنا ہے
تمھارے دل میں رہنا ہے
لہو میں سرسرانا ہے
رگوں میں پھیل جانا ہے
ہمیں تم سے محبت ہے
یہی باور کرانا ہے
زبانیں گنگ ہو جائیں
لبوں پر لفظ جم جائیں
تو آنکھیں بات کرتی ہیں
جب آنکھیں بات کرتی ہیں
تو سب کچھ بول دیتی ہیں
لبوں پر لفظ جم جائیں
تو ان کو کھول دیتی ہیں
بہت سی ان کہی باتوں کا مطلب کھول دیتی ہیں

ہمارے درمیاں برسوں سے وہ گہرے مراسم ہیں
بہت وافر مواقع ہیں ہمیں ملنے ملانے کے
یہاں کیمپس کے اندر بھی
وہاں کیمپس سے باہر بھی
ریاضی کے سوال اور فلسفے کی گتھیاں
جاناں
اکیلے بیٹھ کر ہم بارہا سلجھا تو لیتے ہیں
بہت سے مسئلوں میں اپنا آپ الجھا تو لیتے ہیں
فراغت۔ ہوں تو پہروں چاندنی کا
رقص تکتے ہیں
اکٹھے بیٹھ کر پانی میں اپنا عکس تکتے ہیں
مگر جو بات کہنی ہے وہ اب تک کہہ۔ نہیں پائے
ہوا کے ہاتھ بھی تجھ کو کئی پیغام بھیجے ہیں
گلاب اور موتیے کے پھول صبح شام بھیجے ہیں
تواتر سے یہ سندیسے تمھارے نام بھیجے ہیں
مگر الجھن پرانی ہے وہی حرف و معانی

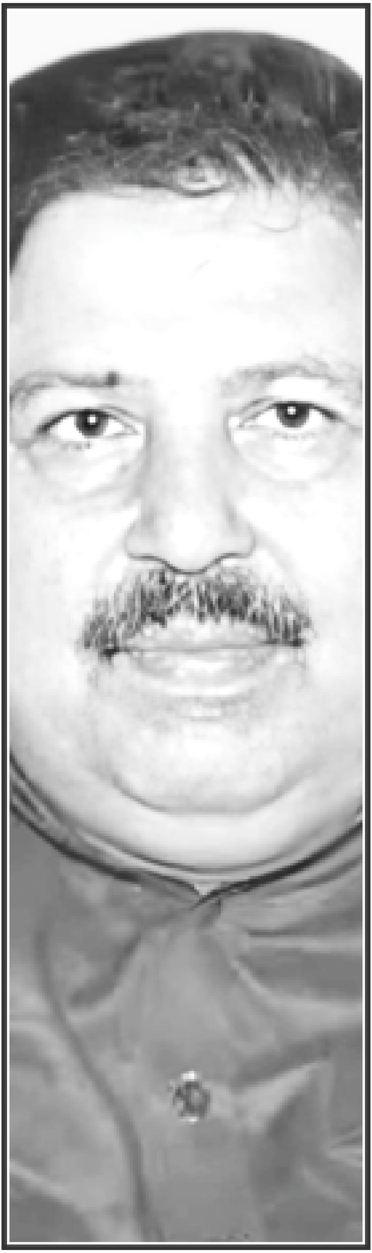

مسعود احمد

ہمیں آتا نہیں شاید ابھی اظہار کرنا بھی
تمھیں آتا نہیں شاید ابھی اقرار کرنا بھی

بہت دشوار ہے یہ مرحلہ سر کرلیا جائے
اگر اقرار کرنا ہے تو کھل کر کرلیا جائے

بغیر الجھے ہوئے الجھے ہوئے حرف و معانی ۔ میں
بغیر الجھے ہوئے گفتار کی شعلہ بیانی میں

حقیقت ہے حقیقت کا ہمیں ادراک کرنا ہے
یہ سارا سلسلہ صوت و صدا سے پاک کرنا ہے

سر افلاک کرنا ہے
یا زیر خاک کرنا
تمھیں پھر سے بتانا ہے
یہی باور کرانا ہے
زبانیں گنگ ہو جائیں
لبوں پر لفظ جم جائیں
تو آنکھیں بات کرتی ہیں
جب آنکھیں بات کرتی ہیں
تو سب کچھ بول دیتی ہیں
لبوں پر لفظ جم جائیں تو ان کو گھول دیتی ہیں
بہت سی ان کہی باتوں کا مطلب کھول دیتی ہیں

گڑیا [نثری نظم]

لوگ کہتے ہیں مجھ کو گڑیا ہوں
تم ہی بتلاؤ کیا میں گڑیا ہوں؟
ایک پیکر، بھلے سے نازک ہے
اس کی لیکن زبان ساکت ہے
اک تکلم کہ جس پہ حق سب کا
مجھ پہ اس گفتگو کی قدغن ہے
ایک گڑیا نہیں ہوں
مرقد ہوں
جس سے پھولوں کی چادریں پیوست
یہ بھی ممکن ہے کاٹھ جیسی ہوں
جس کے پرزے اسے ہلاتے ہوں
جس کی چابی اسے گھماتی ہو
ایسی گڑیا ہوں جس میں میخیں ہیں
جانے کس کس کی گاڑھی کیلیں ہیں

کاش جادو کا کوئی توڑ ملے
کاش کہ قید سے رہائی ہو
میرے اندر بسے پیکر میں
ایک عورت کو بھی زبان ملے
ایک موضوع جسے بیان ملے

فرخندہ شمیم

کایا کلپ

آگہی سے تہی
وہ قیدی، وہ وحشی
قرنوں تلک بیگار میں جتے رہے
شاہی سطوت کے شایانِ شان
قلعہء عظمت تعمیر ہوتا رہا
انائے عالی سنگِ گراں میں ڈھلتی رہی
کبھی کبھی وہ قوی ہیکل
دزدیدہ نگاہوں سے
گلاس ہاؤس کی جانب تکتے، تو
کثیف تیرگی زعمِ ضیا پر ایسے جھپٹتی، کہ
روشنائی کے جادے خمیدہ ہو جاتے

نحیف تجاذب
ایک شکاری کا نام ہے
وگرنہ
تعینات کے مقدر میں
تعین لکھا ہی نہیں گیا

کیا ہوا، اگر
دیو قامت کاریگروں پہ کھل نہ سکا
تختِ سلیمانی پر وہ اجسام پڑا ہے
تاریخ جسے دیمک زدہ عصا کہتی ہے
کہ، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا
عہدِ زوال میں
لکڑی کا کیڑا بنا جائے
یا
کتاب کا کیڑا

جمیل احمد عدیل

اُدھورے لوگ

ہماری ہتھیلیوں پر لکیریں منزل کا پتا دیتی تھیں
مگر راستے ہمیشہ نامعلوم رہے
ہم نے لمبی مسافت کے نقشے بنائے
مگر سفر کی دھول نے ہر نقشہ دھندلا کر دیا
زندگی کی بساط بچھی تو
مہرے اپنے تھے اور چالیں بھی اپنے ہاتھ میں تھیں
مگر وقت نے ہر بار کھیل کا قاعدہ بدل دیا
ہماری خواہشیں زنگ آلود کنجی جیسی تھیں
جس کا تالا برسوں کے انتظار کے بعد
خود کو یاس و ناامیدی کے سپرد کر چکا تھا
کچھ لوگ ہماری زندگی میں اُدھورے
جملوں کی مانند آئے
کچھ لفظ کہے اور کچھ اَن کہے چھوڑ دیے
اور ہم تمام عمر کہے اَن کہے لفظوں میں چھپے
معنی تلاش کرتے رہے
کچھ راز ہم نے آئینے کو بتانے کی سعی کی
ہم آئینے کو مسافت کی کہانی سناتے رہے
اور آئینہ ہم سے سوال کرتا رہا کہ تم زندگی
خود کیوں نہیں جیے؟
ہم لوگ خالی کمرے کی کھڑکی کے پاس
لگے وہ پیڑ تھے
جس پر ہر موسم میں ایک نئی حسرت اُگتی رہی
اور اطراف شور مچاتی تشنگی اور لاحاصل کی کیفیت
کتنے اُدھورے لوگ تھے ہم! کہ ہم نے
خوابوں کے چراغوں کی لو کو صبح تک تھکتے دیکھا
اور سرابوں کے شہر میں لاحاصل کی تشنگی
لیے پھرتے رہے
کتنے اُدھورے لوگ تھے ہم بھی!

طلعت شبیر

دُعا

روشنی ہونے کے اِمکان بڑھے جاتے ہیں
اَمن کے دیپ اندھیروں میں جلے جاتے ہیں

جنگ کب اَمن پہ راضی بہ رضا ہوتی ہے
درد کے گھاؤ یہ انسان سہے جاتے ہیں

شاخِ زیتون کسی ہاتھ میں بس دی جائے
کیسی نفرت ہے یہاں لوگ پسے جاتے ہیں

صاحبِ دُنیا قیامت کی گھڑی ٹال ذرا
ورنہ یہ زخم جدائی بھی بڑھے جاتے ہیں

ٹوٹے پتوں کی طرح لوگ ہیں اِس جنگل میں
مُرجھائے ہوئے سب خاک ہوئے جاتے ہیں

اَمن کے واسطے جنگوں کی ضرورت کیا ہے
اِک محبت ہی ضروری ہے کہے جاتے ہیں

آسناتھ کنول

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرمِ نوا رہتے ہیں

پہیلی

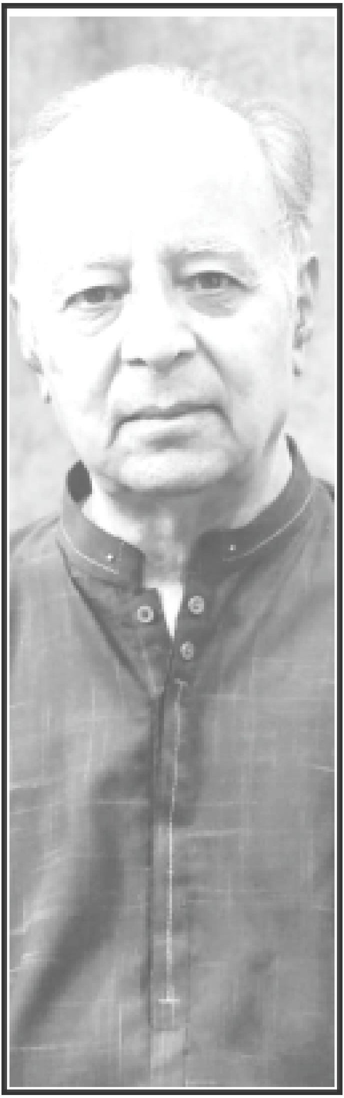

خواہشوں کے جھولے میں
زندگی کے بچے کو
کب تلک جھلاؤ گے
خواہشیں ہزاروں ہیں
زندگی اکیلی ہے
جیسے اک پہیلی ہے
کوئی بوجھ لیتا ہے
اور کوئی گنجلک میں
مدتوں سے اُلجھا ہے
اپنی ذات سے ہٹ کر
اپنے آپ سے کٹ کر
زندگی کے بچے کو
کون چھوڑ سکتا ہے
زندگی سے خواہش کا
اک اٹوٹ رشتہ ہے
کون توڑ سکتا ہے

سمیع اللہ عرفی

سپنا کوئی سجاؤ

جاگ رہی ہو
اب تک تم کیوں جاگ رہی ہو
نیند تمھاری آنکھوں میں ہے
سو جاؤ
روح تمھاری کیوں بے چین سی لگتی ہے
آج تمھارے
چہرے پر مایوسی کیوں ہے
روشن آنکھیں
بھیگی بھیگی کیوں ہیں
پاگل لڑکی
چاند ستارے تم کو جاگتا دیکھ رہے ہیں
آؤ سنو
خاموش فضا میں سازوں کی آواز سنو
اور سو جاؤ
پلکوں کی دہلیز پہ بیٹھے
خواب تمھارا رستہ دیکھ رہے ہیں
بھیگے سرد سے اس موسم میں
اپنی گہری آنکھوں میں
دھیمے دھیمے لہجوں والے سپنوں کو
پلکوں سے بہلاؤ تم
سپنا کوئی سجاؤ تم
پچھلا سفر تمام کرو
نئے سفر کو نکلو تم
پھر سے تم ان بھیگی بھیگی آنکھوں میں
جادو بھری نگاہوں میں
آس کے دیپ جلاؤ
سپنے نئے سجاؤ
اور سو جاؤ
ہاں...... سو جاؤ

عون الحسن غازی

لڑکھڑاہٹ

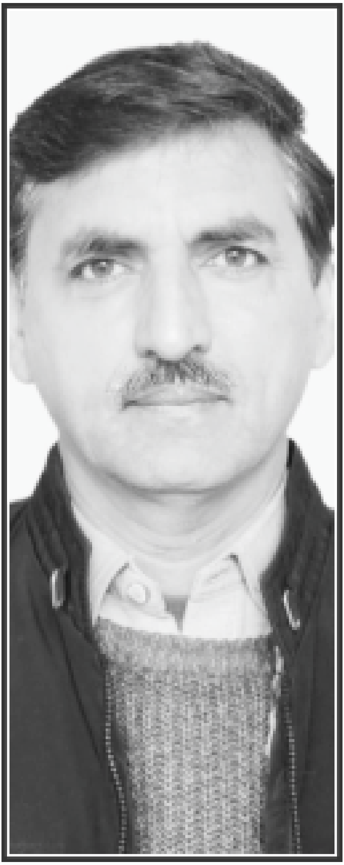

میں سمندر کی تہہ دیکھ آیا تھا
تبھی سے لڑکھڑا رہا ہوں
زمین بدل رہی ہے
نئے تناظر
نئے شگوفے
نیا جغرافیہ
آسمان بدل رہا ہے
نیلاہٹ کا حسن
سرخی میں ڈھل رہا ہے
جھیل بدل رہی ہے
کبھی چاند کی ہمراز تھی
اب وسوسوں کی نگہبان ہے
اور ہم؟
کس سمت جا رہے ہیں
شاید
جہنم کی طرف

امجد بابر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک بے خبری مایۂ اربابِ خبر تھی
یہ بات کھلی، حیرتِ اربابِ نظر سے

لمس کا ہالہ

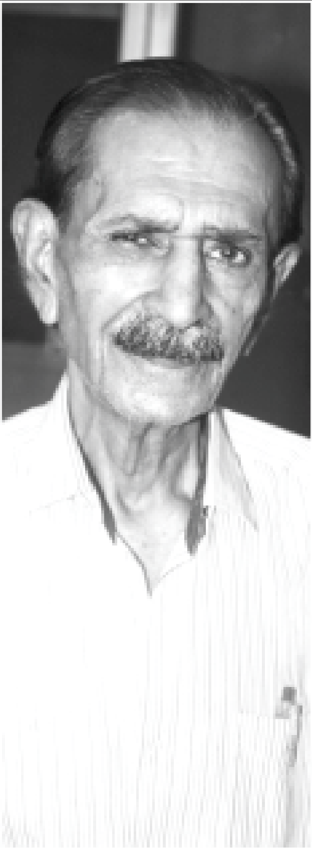

دیکھتی ہے کہ دیکھتا
جب کبھی اُن آنکھوں نے دیکھا
یہی خیال رہا
دیکھتی ہے کہ دیکھتا
محبوب کہ محبوبہ
یا پھر دونوں کا ملغوبہ
لمس ولذت کا غلبہ تھا
محبوب تھی کہ محبوبہ
دل ودماغ سے پوچھا اور کچھ نہ سوجھا
لمس وجلت پیار اور لذت کے ہالے کا سایا تھا
یہی کچھ
سمجھ میں آیا تھا

اکرام حشمت

شام تو ہم نے کر لی مگر
تجھ بن کیوں کر ہو گی سحر

---------انتخاب---------

- خالد احمد -

-------نعمان منظور-------

وطن

وطن اک سر جو مانگے تو ہزاروں سر کٹا دینا
وطن کے سر پہ سہرا جان کر اپنی سجا دینا

وطن کی پاک مٹی سے ہی پیار وہ ہے ضمیر اپنا
وطن کے پیار سے وابستہ ہے یارو ضمیر اپنا

عدو کو صفحہ ہستی سے آتا ہے مٹا دینا
وطن اک سر جو مانگے تو ہزاروں سر کٹا دینا

کچھ ایسے رکھ دیے تھے خوں کے دریا پاٹ کر ہم نے
دکھائی سب کو زنجیر غلامی کاٹ کر ہم نے

ہمیں آتا ہے یہ اعجاز دنیا کو دکھا دینا
وطن اک سر جو مانگے تو ہزاروں سر کٹا دینا

زمانہ جانتا ہے بازوئے شمشیر زن ہم ہیں!
دلاور ہیں، جری ہیں، اور پھر خیبر شکن ہم ہیں

ہمیں آتا ہے، ہر دیوار کو راہ سے ہٹا دینا
وطن اک سر جو مانگے تو ہزاروں سر کٹا دینا

خالق آرزو

ریت

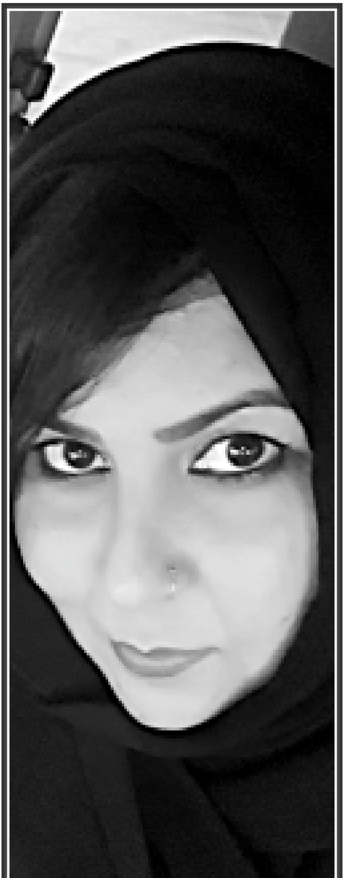

فرح شاہد

میں نے آخری وقت تک
اس کا رستہ دیکھا تھا
اور نجانے کتنے سالوں سے
اس کی منتظر میں اب بھی ہوں

اس نے ساتھ دینے اور چھوڑ جانے
دونوں کو ایک ہی صف میں
لا کھڑا کیا تھا......
کہ اس کی فطرت وفا شناس نہ تھی......
یوں مری نظروں کے سامنے ہی
وہ غیر کا ہاتھ تھام کر
مری وفا پر مٹی ڈال کے
مجھے زندہ ہی دفن کر گیا......
میں نے آخری وقت تک
اس کا رستہ دیکھا تھا
کیوں بھول گئی؟......
وہ شخص ریت جیسا تھا
اور ریت کو جتنا بھی
مٹھی میں بھر لو
وہ ہاتھوں سے نکل جاتی ہے۔

اے مری جانم

تجھے سوچوں تو زندگانی
بہار لگتی ہے مجھے
تمھاری چاہت کے رنگ سارے
مہکتی سانسوں میں رچ گئے ہیں
تمھاری آنکھوں کے خواب سارے
مری شبوں کو نکھارتے ہیں
تمھارے ہونٹوں کی مسکراہٹ
گزرتے جیون کا آسرا ہے
دھڑکتے پل کی یہ ساری خوشیاں
تمھارے دم سے ہیں مری جانم
اپنے رب سے یہی دعا ہے
کہ تیری چاہت کے سلسلے یہ
مری رگوں میں ہو کی صورت مچلتے
جائیں، وفا لٹائیں

اے مرے جانم، اے مرے جانم
تجھے سوچوں تو زندگانی
بہار لگتی ہے مجھے
قرار لگتی ہے مجھے
پیار لگتی ہے مجھے

یٰسین بھٹی

مستعار شکلیں

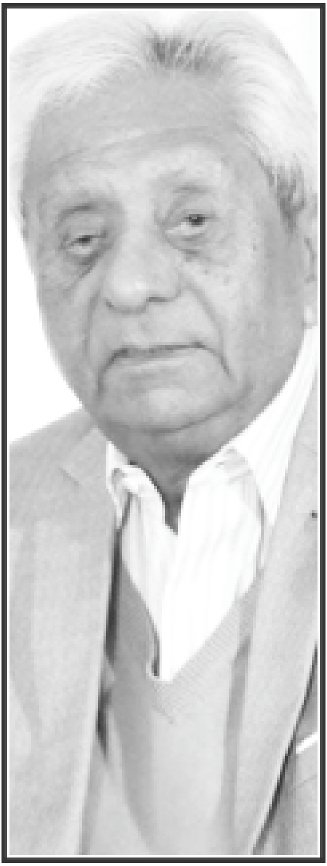

فیاض تحسین

مرے ضمیر! بس اب تو مجھے رہائی دے
رہائی دے کہ مری ذات بھی زباں کھولے
جہاں کو جیسے بھی دیکھے اُسی طرح کہہ دے

مرے ضمیر کبھی خود کو بھی رہائی دے
رہائی دے کہ ترے آئینوں میں سب شکلیں
مجاوروں سے، حکومت سے، بادشاہوں سے
تمام رنگ مگر مستعار لیتی ہیں
اور ایک بار نہیں بار بار لیتی ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر ہاتھ پہ دھر دیتے ہیں عمروں کا تحیر
یہ لوگ تو آنکھیں بھی چرانے نہیں دیتے

تمھارا چہرہ

تمھارا چہرہ تمھاری صورت
غزل ہو جیسے
غزل بھی میر و منیر کی ہو
غزل بھی فیض و فراز کی ہو
تمھاری آنکھیں خیام کی ہوں رباعی جیسے
عدم کا شیریں کلام جیسے
تمھارے ہونٹوں کی نازکی نے جنم دیے ہیں
ہزروں شاعر، ہزاروں مطرب
تمھارے عارض قسم خدا کی
ہے چاند جیسے
گلاب جیسے
شباب جیسے
تمھاری ساحر گداز بانہوں نے زندگی دی
فصاحتوں کو
بلاغتوں کو
سروں کے رنگوں کے معجزوں کو
نہ جانے کتنے بنے مصور
نہ جانے کتنوں نے پتھروں میں
جمال ڈھونڈا حیات ڈھونڈی
نہ جانے کیا کیا جہاں سجائے
نہ جانے کیا کیا فسوں جگائے
بتاؤں کیسے کسے بتاؤں!
بتاؤں کیا کیا،
بتاؤں کیا کچھ

شیخ اقبال

درد کی آخری کڑی بے حسی سے جا ملتی ہے [نثری نظم]

ہم عادی ہو گئے ہیں
موت کی سرخیاں پڑھنے کے
اخبار ہو یا نیوز چینل
ہر حادثہ پہلے حادثے سے زیادہ تکلیف دہ لگتا ہے
ہم نادیدہ ہاتھوں کے منتظر رہتے ہیں
جو وقت کو بدل ڈالیں گے
وقت سست روی سے بڑھ رہا ہے
مایوسی کی دھند نے وجود میں وہ تھکن
بھر دی ہے
کہ آوازیں سینے میں گھٹ کر رہ گئی ہیں
بلندی نہیں ہو پاتیں
ہم فقط خاموش احتجاج ریکارڈ کروا سکتے ہیں
مردہ سوچیں جذبوں کو گھن لگا دیتی ہیں
سوچ کے تعفن سے گدھ بھی خائف لگتے ہیں
چلتے پھرتے لاشے گلی سڑی فکر کے ساتھ
زندگی کی انگلی تھامے
اندھے راستوں پر رواں ہیں
یہ جانے بنا کہ اگلا پڑاؤ کہاں ہوگا
مردہ دلوں میں جذبوں کی کونپل نہیں پھوٹتی
بیداری جذبوں کی مرہونِ منت ہے
خواب اب آنکھوں میں نہیں اترتے
شائد سب نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے
تا دیر یہ درد وا کئے گھر دستک نہ دے
درد کی آخری کڑی بے حسی سے جا ملتی ہے
جہاں درد معنی نہیں رکھتا
وجود درد میں ڈھل جاتا ہے

نائلہ راٹھور

خالی جگہوں کا فضلہ اور ٹیوشن

خالی جگہیں پر کرنا
مشکل ہوتا ہے
اس بار تو اس نے "مناسب" الفاظ بھی
نہیں دیے تھے
وہ تھوڑی سی دیر بعد
ممکنہ الفاظ اگل دیتا اور
میرے لیے چناؤ بہت
دشوار ہو جاتا
پھر اس کے منہ سے

فضلے کی طرح بدبودار
لفظ گرنے لگے
اور مجھے
ہوم ورک
چھوڑ کر
اٹھنا پڑا

☆☆☆☆☆

ذہین احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عشق میں تم دم دم تسبیح ذکر بڑھاتے جانا
لیکن ، دانہ دانہ حساب ماہ و سال نہ کرنا

ڈاکٹر صاحب! (نثری نظم)

ڈاکٹر صاحب!
گزشتہ کچھ عرصے سے
ہر تصویر بدلی بدلی
ہر شے دھندلی دھندلی سی
دکھتی ہے
رفتہ رفتہ سارے عکس بدل رہے ہیں
خاص طور پر مرے وہ اپنے تو
جیسے کہیں کھو گئے ہوں
وہ بچپن بیلی
جو حسد اور جلن، بغض و عداوت
کے جذبات سے عاری
چونّی، اٹھنّی جیب میں لیے
بھوکے پیٹ سارا سارا دن
غیر معمولی فقروں پہ مسکراتے رہتے
کبھی بُرا نہ مناتے
نام و نسب کے راگ نہ الاپتے

ہر چند کے اب ہر کیفیت
اور کچھ طبیعت میں کافی بدلاؤ آچکا ہے

ڈاکٹر صاحب!
کوئی بڑا
ہائی کوالٹی کا 'دارو'
لکھ دیں
جس سے آنکھوں میں پڑے
جالے چھٹ جائیں
ہر شے اُجلی اُجلی
نکھری نکھری دکھے

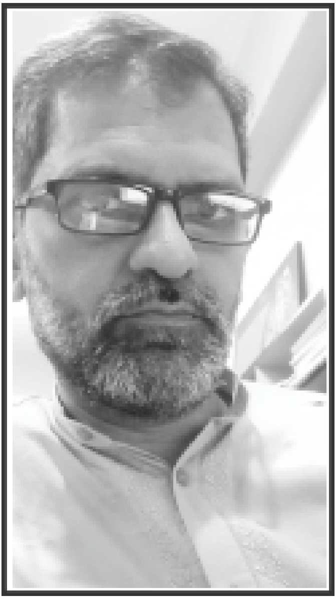

محمد عبداللہ

بڑے شخص سے چھوٹا سوال

اعجاز رضوی

ٹھہرو اور مجھے بتاؤ
آنسو پونچھنے والا رومال
مانگنے والی جھولی کیسے بنا
کیسے بنا سہارا دینے والا ہاتھ
کلہاڑی
پرندے بلاتا شجر، کیوں چیخ اُٹھا
آنکھ میں مٹی گری تو دل میں
بیٹھے کبوتر کیوں اُڑ گئے
ٹھہرو اور مجھے بتاؤ،
تمھاری گاڑی
فٹ پاتھ پر بیٹھے ازلی گداگروں کو کیوں
روندرہی ہے
ٹھہرا اور مجھے بتاؤ، ٹھہرا تو سنو تو
میں کچھ کہہ رہا ہوں، سُنو تو ٹھہرو تو

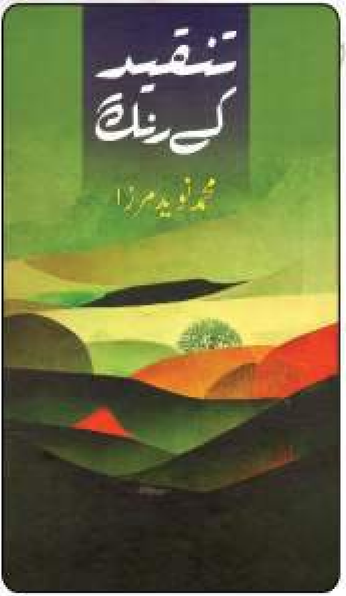
تنقید
کے رنگ
محمد نوید مرزا

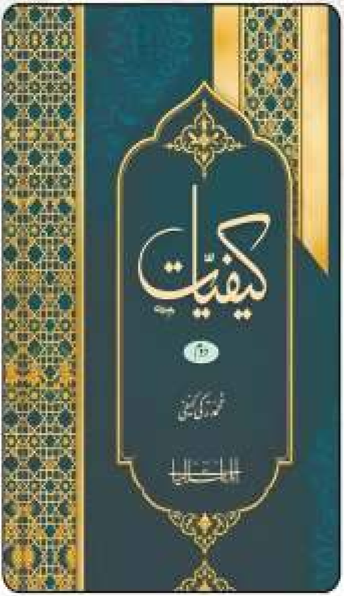
کیفیات

غم دل
شاداب صدیقی

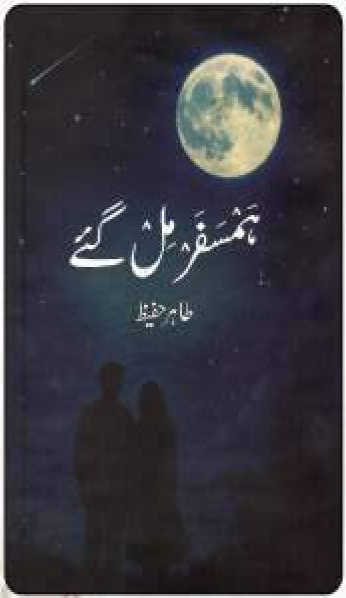
ہمسفر مل گئے

جناب حامد یزدانی، جناب عمران منظور، جناب امیر حسین جعفری